حاصلِ حیات

اخلاقی ثقافتی اور رُومانی نظریات کا شعری مجموعہ

بسمل دہلوی

بار اوّل .... ایک ہزار

سنہ ۱۹۶۳ء

سری رگھو نرائن گپتا مینیجر دہلی پرنٹنگ ورکس
چاوڑی بازار دہلی
کے اہتمام میں طبع ہوئی

قیمت : پانچ روپے ۵/=

دیباچہ

(صاحبِ فضائل محترمہ رامیشوری نہرو)

بسملؔ صاحب دہلوی جن کے روح افزا کلام سے اردوداں حضرات ناواقف نہیں ہیں۔ اور جو اپنے مقبولِ عام اشعار سے اردو ادب کی ایک مدت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آج پھر اپنے جدید نظریات کا ایک شعری مجموعہ پیشِ ناظرین کر رہے ہیں۔

اس مجموعہ میں مختلف خیالات و جذبات کو نہایت موزونیت کے ساتھ شعریت کی بندش میں لاکر واضع کیا ہے۔ اس میں عشق کی آہ وزاری اور وصل و فراق کے دل ہلا دینے والے فرسودہ مضامین ہی نہیں ہیں بلکہ حبّ الوطنی۔ ارتقائے ملکی اور شہیدانِ حریت کے لئے عزت و عظمت کے پاکیزہ جذبات سے لبریز پراثر کلام موجود ہے۔

چنانچہ شہیدِ اعظم سردار بھگت سنگھ کی یاد میں کہی گئی پُردرد نظم اس دن کی یاد دلاتی ہے جب بھارت کا یہ نوجوان دیش کی آزادی کے لئے پھانسی کے تختے پر چڑھ کر قربان ہوا تھا، لہٰذا کہتے ہیں ؎

تیرے ایثار نے بدلی ہے وطن کی تقدیر　　آج تاریخِ شہادت میں نہیں تیری نظیر

اسی طرح آزادی کے نئے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ اپنی عقیدت و مسرت یوں نظم کرتے ہیں۔

خطوطِ عہدِ غلامی مٹے جبینوں سے　　نگاہ لڑنے لگی آسماں نشینوں سے

لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن کا بیان بھی کرتے ہیں جن کا احساس آج کے عہد میں ہر بشر کو ہے یعنی

مگر۔ ابھی ہے بہت دُور منزلِ مقصود　　ابھی شعورِ اخوت کا جام باقی ہے

ابھی وطن کی عمارت ہے تشنۂ تکمیل　　ابھی حصولِ نشاطِ مرام باقی ہے

آپ کے متعدد اشعار سرمایہ دارانہ نظام پر بھی ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

نقرہ و زر سے اگر طائر کے پر منڈھو گے تم　　طاقتِ پرواز سے محروم کر دو گے اُسے

زندگی بھر جو چلا دولت کا دامن تھام کر　　زندگی بھر آگ کے دریا میں دیکھو گے اُسے

ذیل کے چند اشعار میں بھی شاعر نے اپنے تجربہ سے زندگی کے جن اسرارِ مستور کا انکشاف کیا ہے قابلِ ستائش ہیں۔

خود اپنے آپ چمکنے کی جس میں قدرت ہو　　وہ ذرہ منتظرِ فیضِ آفتاب نہیں

یہاں انسان کچھ ملتے تو ہیں کامل نہیں ملتے　　اگر اہلِ نظر ملتے ہیں۔ اہلِ دل نہیں ملتے

المختصر بسمل صاحب کی اس نئی اشاعت کا میں دل سے خیر مقدم کرتی ہوں اور پُر امید ہوں کہ اُردو داں لوگ اسے پڑھ کر حظ اٹھائیں گے اور مستفیض ہوں گے۔

رامیشوری نہرو

تعارُف

(ڈاکٹر تارا چند ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ میمبر پارلیمنٹ نئی دہلی)

جنابِ بسمل دہلوی ایک کہنہ مشق اور پختہ خیال شاعر ہیں خلیق، متین اور علم دوست انسان ہیں۔ وہ اس پرانی تہذیب کے نمائندہ ہیں جو ظاہری دنیا سازی سے پرہیز کرنا سکھاتی ہے اور خوش نیتی، مروّت اور خلوص کی طرفداری کرتی ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی ذاتی خوبیوں کی عکس بردار ہے۔ غزل ہو یا نظم دونوں صنفوں میں آپ نے انہیں قدروں کو سراہا ہے جو انسانیت کے اعلیٰ جذبات کی حامل ہیں تغزل میں عشق و محبت کی کیفیتیں بیان کی ہیں جو ہوا و ہوس کی آلائشوں سے پاک ہیں۔ ان کے نزدیک حُسن کے دلدادہ کے لئے حیا لازم ہے ؎

جوانی کا اور رُوپ کا وہ پُجاری عروسِ حیا کا پرستار بھی تھا

پھر اُن کا عشق مجازی کی پستیوں سے بہت اونچا ہے ؎

نویدِ وصل دنیا وہ مجھے پلکوں کے سایہ میں دو عالم کی حدوں سے ماورا ہونے کا وقت آیا

اور اس کی بلندی کا اندازہ یوں بیان کرتے ہیں ؎

محبّت ایک ایسا جذبۂ پاکیزہ ہے بسمل کہ جھک جاتی ہے خالق کی جبیں اس آستانے پر

عشق اور حسن میں جو تعلق ہے اُسے شعرا نے طرح طرح سے بیان کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ساری شاعری کی بنیاد ان دونوں پر قائم ہے۔ بیدل نے جس انداز سے انھیں باندھا ہے وہ بہت لطیف ہے۔ عشق نام ہے جذبۂ کامل کے اظہار کا۔ اس کے لیے پوشیدگی بھی لازمی ہے۔ لہذا کہتے ہیں ؎

اظہارِ حال موجبِ توہینِ عشق ہے ضبطِ فغاں خلاصۂ آئینِ عشق ہے

حُسن کو حیرت زدہ اور عشق کو آئینہ بتایا ہے۔ سوال کرتے ہیں کہ حُسن کو پریشانی کیوں ہے؟ جب عشق حُسن پر فریفتہ ہے اور اعلانیہ اس کا دم بھرتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حُسن کو بلا تکلف سامنے آجانا چاہیئے۔ کہتے ہیں ؎

دل مٹو ہے مگر سوزِ درد ول ہے محروم فکر زندہ ہے مگر مائل پرواز نہیں
حُسن غلطیدۂ دریلئے تحیّر کیوں ہے سینۂ عشق میں پوشیدہ کوئی راز نہیں

زندگی کے متعلق ہندوستان کا وہی مایۂ ناز نظریہ ہے جو اُپنیشدوں کے زمانے سے رائج ہے۔ گو روحِ انسانی بالذات اصل حقیقت ہے لیکن عالمِ ظاہر میں حقیقت سے جُدا ہے۔ اس چہ گومگی سے آدمی حیران ہے۔ جُدائی کے درد سے پریشان ہو کر زندگی کو مصیبت، موت کو نجات اور دُنیا کو فریب سمجھتا ہے۔ لہذا شاعر پوچھتا ہے کہ ؎

اک سوزِ ناتمام۔ اک ذرۂ بے ثبات اے رحمتِ تمام! بتا۔ مجھ کو کیا دیا

کہیں زندگی کو جنونِ عشق کا مترادف سمجھتا ہے۔ یعنی ؎

جنونِ عشق نہیں ہے تو زندگی کیا ہے جنونِ عشق ہے قائم فراقِ منزل سے

عشق کا دُوئی پر انحصار ہے لیکن دُوئی کا وجود نہیں تو عشق کی وجہ کیا ہے۔ جواب

دیتے ہیں ؎

ہے بے نیازِ سجدہ درِ کعبۂ جمال ! لیکن میں اپنے ذوقِ عبادت کو کیا کروں
اظہارِ تشنگیٔ محبت گناہ ہے احساسِ بے پناہِ محبت کو کیا کروں
کچھ اس کے التفات کی صورت نکل تو آئے میں اپنی خود شناس طبیعت کو کیا کروں

لیکن انسان کیوں عالمِ رنگ و بو میں قید ہے ؎

میں ایک دریائے بیکراں ہوں مگر بچشمِ عتابِ ساقی اسیرِ زندانِ جسم ہو کر حدِ تعین میں آگیا ہوں

اسی وجہ سے غم اس زندگی کا ساتھی ہے ؎

جب تک اس باغِ جہاں میں ہم رہے مبتلائے آفتِ پیہم رہے
ہم بنے ہیں تختۂ مشقِ ستم امتحاں گاہِ وفا میں ہم رہے

لیکن بلائے غم والم سے اور کوفت سے دب جانا مرد کو زیب نہیں دیتا اس لئے ؎

پرشِ شمشیر بھی کرنے نہ پائے سرنگوں آدمی کو اس قدر خوددار ہونا چاہیئے
جھوم کر لب رکھ دیئے جس نے لبِ تلوار پر ایسے دل والے سے ہم کو پیار ہونا چاہیئے

اسی خودداری کی ذیل کے شعر میں توجیہہ کی ہے ؎

تو ہی ہے حاصلِ بزمِ دو عالم تیری منزل ورائے کہکشاں ہے

بسمل کی شاعری کا ایک پہلو فلسفیانہ بھی ہے۔ لیکن بسمل موجودہ دور کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری پر زمانۂ حاضر کے خیالات و جذبات کا گہرا اثر ہے۔ چنانچہ اس گلدستہ کا متعدد حصہ قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ چند نظموں کے عنوان ہیں "انسانِ عظیم" یعنی گاندھی جی کی شان میں" "انسانِ کامل" ڈاکٹر راجندر پرشاد کی تعریف میں" "محبوبِ جواہر" جو جواہر لال نہرو کی مدح میں ہے۔ اس نظم کا ایک بند سنیئے ؎

عاشقِ حسنِ وطن طالبِ ناموسِ وطن	ایسا مونس جسے معبودِ مروّت کہیے
ایسا دل گرم نہیں جس کی زمانے میں نظیر	ایسا دلجو جسے مسجودِ محبت کہیے
بندۂ شانِ خودی مالکِ اسلوبِ جمیل	ایسا مخلص جسے مقصودِ ریاضت کہیے
فرقہ داری کا جو دشمن ہو وہ انسان ہے یہ	نظمِ قومی کے لئے صرف پریشان ہی یہ

ایک نظم "کسان" کے عنوان سے ہے جس کے مقطع میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہی۔ کہا ہے ؎

نگاہِ شاعر میں اے جفاکش تو آن داتا ہی کل جہاں کا
مگر جہاں کی نگاہ میں تو مجسمہ ہے غمِ نہاں کا

یومِ حریت کی خوشی مناتے ہیں لیکن یہ جتا دیتے ہیں کہ آزادی کا منشا ابھی پورا نہیں ہوا کہتے ہیں ؎

مگر۔ ابھی ہے بہت دور منزلِ مقصود	ابھی شعورِ اخوت کا جام باقی ہے
ابھی وطن کی عمارت ہی تشنۂ تکمیل	ابھی حصولِ نشاطِ دوام باقی ہے
کچھ اور چاہیے عزم و عمل میں سرگرمی	سحر کی آنکھ میں تصویرِ شام باقی ہے

الغرض یہ چند اقتباسات اِس صحیفہ کی خوبیوں کا نمونہ ہیں۔ اِن سے بسملؔ کے زورِ قلم اور علوئے تخیل کا اندازہ ہو جاتا ہی۔ مجھے اُمید ہے۔ اس کی اشاعت سے بسملؔ کی شہرت کو دوام حاصل ہو گا۔

تاراچند

"تبصرہ"

(جناب بشور پرشاد منوّر لکھنوی)

بسمل دہلوی صاحب کو ابھی میری طرح بہت مدت تک جینا ہے۔ اور بڑے بڑے ادبی کارنامے سرانجام دینا ہیں۔ پھر معلوم نہیں۔ انھوں نے اپنے اس مجموعۂ کلام کو اپنا حرفِ آخر سمجھ کر اسے "حاصلِ حیات" کیوں قرار دیا ہے یوں ان کا ہر ادبی کارنامہ جو منظرِ عام پر آچکا ہے۔ حاصلِ حیات کہا جا سکتا ہے "شہیدانِ کمسن" کے مؤلف"، "فکرِ بلند" کے مصنف اور گوروارجن دیو کی "سکھ منی صاحب" کے بے نظیر مترجم کے قلم سے نکلا ہوا ہر حرف حاصلِ حیات ہی ہونا چاہیئے۔

سکھ منی صاحب کے ترجمہ میں "معمورۂ انوار" کے عنوان سے انھوں نے جو چار اشعار درج کئے ہیں شعر و ادب کی دنیا میں ان سے زیادہ ثبوت بسمل صاحب کی بلند خیالی۔ روشن ضمیری اور عرفان نظری کا اور کیا مل سکتا ہے ——— فرماتے ہیں:۔

دل آئینہ سیما ہو اگر سوزِ یقیں سے
سجدوں کا تعلق رہے در سے نہ جبیں سے

ہستی کے مقامات ہوئے غیب سے روشن
گردوں پہ نظر کی جو کبھی اُٹھ کے زمیں سے

دنیا کو کہاں معرفتِ گردشِ دَوراں
ٹکرائیں گے ذرّے یہ کبھی عرشِ بریں سے

دیکھا ہے کبھی آگ کے دریا میں اُتر کر
تکمیلِ محبت کا ہے آغاز یہیں سے

ان اشعار کی تغزل میں سموئی ہوئی اور وحدانیت سے بھری ہوئی نغمگی سے متاثر ہو کر کس پر حال کی کیفیت طاری نہیں ہو سکتی اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "حاصلِ حیات" میں کیا کچھ ہوگا۔ میں نے "حاصلِ حیات" کا مطالعہ اطمینان سے نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں۔ میں مصروف قسم کا انسان ہوں۔ اپنے سر پہ نہ جانے کتنی ذمہ داریاں لے رکھی ہیں۔ تاہم "حاصلِ حیات" کو بسمل صاحب کا حاصلِ حیات نہ سمجھتے ہوئے بھی حاصلِ حیات کہنا ہی پڑے گا۔

بسمل صاحب ایک فنکار کی حیثیت سے اپنے مخصوص حلقہ میں بہت شہرت پا چکے ہیں اور انہیں کافی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ وہ محض اخلاقی دادوستائش کی دولت سے مالامال نہیں۔ قدردان اور صاحبِ نظر اصحاب نے ان کے فن کی قدر عملی طور پر کی ہے اور حکومت کی طرف سے بھی ان کی عملی حوصلہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ ان کی اس کامیابی میں جہاں ایک طرف ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو دخل ہے وہاں اُن کی جاذب شخصیت۔ ان کے حُسنِ اخلاق اور ان کی کثیر آمیزی کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ خوبیاں بہت کم ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔ خود میں بقول جوش ملسیانی جلبِ منفعت کے فن سے ناواقف ہوں۔ بسمل صاحب اگرچہ اس معاملہ میں بہت زیادہ کامیاب نہیں

ہیں۔ پھر بھی اُن کی تکمیلاتِ فن کا صلہ انہیں خوب ملا ہے۔

بسمل صاحب کے کلام کی ایک خاص ادا ہے جو انہیں ان کے دوسرے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ بسمل صاحب سے کہیں بھول چوک بھی ہوئی ہو لیکن اس سے کسی فنکار کا دامن پاک نہیں۔ اور میں تو کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ؎

ہم منور نہیں اس نقد و نظر کے قائل رنجشیں لاکھ ہوں جب نقد و نظر سے پیدا

لیکن شاید بیشتر منصف مزاج ناقدوں کو میری اس رائے سے اتفاق ہو کہ بسمل صاحب کے کلام سے اُستادانہ شان ٹپکتی ہے اور اکثر اشعار میں ان کی جرأتِ رندانہ داد لئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ شعر کیا خوب کہا ہے ؎

کیا ہے موت کا میں نے ہمیشہ استقبال تو میرے نزع کے عالم پہ اشکبار نہ ہو

مہاتما گاندھی کے سینہ گرہ کی اصولی عظمت کو سمجھنے والے اس شعر کے متعلق تخیلِ داد سے کام لے ہی نہیں سکتے ؎

سرِ مقتل خود استبداد کا چہرہ اُتر جائے محبت میں اک اندازِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے

بعض اشعار کی سادگی اور واقعیت بھی بے حد پُر اثر ہے ؎

اہلِ دولت سے لطف کی اُمید ؟ سنگ و آہن پہ سر پٹکنا ہے

چشمِ حاسد میں عمر بھر کے لئے خار بن کر مجھے کھٹکنا ہے

بسمل صاحب شاعر بھی ہیں اور دانائے اسرار بھی۔ ان کے اس مجموعۂ کلام کا ایک ایک شعر اس بات کی شہادت دے رہا ہے۔ بسمل صاحب کی غزل ہو خواہ نظم اس میں اُن کے خلوص سے سموئے ہوئے دل کی عکاسی ہے۔ اسلوبِ بیاں

اور حُسنِ بیاں بھی کافی تاثیر انگیز ہے۔

اول تو اُردو زبان اپنی مخصوص خوبیوں کے مدِ نظر خود ہی نہایت شائستہ زبان ہے۔ اس کی ترکیبی ہیئت ہی میں بلا کی جاذبیت ہوتی ہے۔ پھر اگر ایک اچھے فنکار کے قلم سے اس زبان میں جذبات و احساسات کی ترجمانی کی جائے تو اس میں اور بھی نکھار آجاتا ہے۔

بسمل صاحب کی غزلیات کے مُطالعہ سے اس خیال کی تکذیب ہوتی ہے (جو لوگوں میں بالعموم پھیلا ہوا ہے) کہ غزل گوئی کے لئے شاعر کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بالعموم اردو زبان کے مسلمان شاعروں کا بیشتر رُجحان غزل گوئی کی طرف ہوتا ہے اور اس نے ہر زمانے میں بے نظیر اور لافانی غزل گو پیدا کئے ہیں۔ لیکن میرے خیال کے مطابق ؎

نہیں کچھ خضر پر موقوف اِک عالم کا حصّہ ہے
حقیقت میں جو کوئی شے حیاتِ جاودانی ہے

مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں۔ سکھوں عیسائیوں میں بھی اچھے غزل گو شاعروں کی کمی نہیں ہے۔ دیا شنکر نسیم۔ بالکرشن ریحاںؔ، بنواری لال شعلہؔ۔ میرے استاد نوبت رائے صاحب نظرؔ۔ جگت موہن لال رواںؔ، چکبست لکھنوی برقؔ دہلوی، آنند نرائن ملّاؔ اور جگر بریلوی ایسے متغزلین بھی اپنے مُسلمان غزل گو معاصرین سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ بسمل صاحب دہلوی بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور انہیں لائق شاعروں کی صف میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خود غزل کی دیوی کا پرستار ہونے کے باوجود میں اُردو شاعری کو محض غزل گوئی پر ختم نہیں سمجھتا۔ دوسرے اصنافِ سخن میں بھی بلند پایہ شاعری کے بہترین نمونے ملتے ہیں اور ایک قابل اور حقیقی شاعر کے اصلی جذبات اور احساسات کی ترجمانی تو اُسی شاعری میں ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے جو غزل کی پابند نہیں غزل کی ٹکنیک ہمیشہ غزل کو روایتی بنا دیتی ہے۔ ردیف اور قافیہ کی پابندی سے اگرچہ غزل کے حُسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن خیالات بیشتر انہیں کی حد میں رہ کر ادا کرنا پڑتے ہیں۔ دوسرے اصنافِ سخن میں یہ بات نہیں۔ ان کا میدان کھُلا ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں آزاد شاعری کا بھی قائل نہیں۔ اس کے پھیلاؤ۔ اس کے نظامِ ترتیب اور اس کے ابہام کے باعث اس میں دل کشی نہیں پائی جاتی اور وہ ایک قالبِ بے روح نظر آتی ہے۔ اُردو زبان کا مزاج میرے خیال میں آزاد شاعری کا متحمل نہیں مستثنیات کو جانے دیجئے۔

میں بسملؔ صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ "حاصلِ حیات" کو حاصلِ حیات نہ سمجھیں کیونکہ ابھی بقول اقبالؔ

"ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است"

(بشمشور پرشاد منورؔ)

"حاصلِ حیات"

(پنڈت چاند نرائن ریبہ سابق ڈپٹی کمشنر)

شرحِ غمِ حیات ہے یہ "حاصلِ حیات"
یہ "حاصلِ حیات" ہے جذبوں کی کائنات

بسملؔ کی زندگی کی یہ آئینہ دار ہے
اس میں خودی کا رنگ ہے رنگِ بہار ہے

زورِ بیاں ہے اسمیں، زباں کی شگفتگی
پاکیزگی ہے اور تخیّل کی پختگی

ہر شعر اس کا جرعۂ جامِ حیات ہے
اہلِ سخن کے حق میں پیامِ حیات ہے

ہر لفظ ایک شعر ہے ہر شعر ایک باب
فطرت ہے زخمہ ریز تو بسملؔ کا دل رباب

کیوں "حاصلِ حیات" نہ ہو وجد آفریں
دل سے جو نکلیں شعر تو کیوں ہوں نہ دلنشیں

حُسنِ بیاں کا حُسنِ تخیّل کا امتزاج
اہلِ نظر سے کیوں نہ لے تحسین کا خراج

چاندؔ

"وصالِ منزل"

شکر ہے کہ لغزشوں سے بھرپور یہ مجموعہ ایک مدت کے بعد منظرِ عام پر آسکا ہے۔ اگر اہلِ دل اور اہلِ نظر کو اس میں کوئی کام کا شعر مل جائے تو میری کاوش کامیاب کاوش ہے کیونکہ دانا و بینا خوبیوں کے موتی چُنا کرتے ہیں خامیوں کے سنگریزے نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ شاعر کی جگر کاوی اور محنت پژوہی کی عملی داد زمانے نے بہت کم دی ہے۔ پھر مجھے کیا شکوہ ؎

گردشِ ایام پر رونا نہیں آتا مجھے
دل بھر آتا ہے تپاکِ اہلِ دُنیا دیکھ کر

تاہم میں ایسا برگشتہ بخت بھی نہیں کہ اربابِ توفیق نے میری طرف التفات ہی نہ کیا ہو۔ حالانکہ وہ التفات طویل عریض ریگستان میں ایک قطرۂ آب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن بقول خود ؎

کیوں کھو رہا ہے شکوۂ غم سے وقارِ غم　　اے تشنہ مراد! وہ یہ بھی اگر نہ دے

میں ۲۲ نومبر ۱۹۶۲ء کو عزت مآب ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند سے مشرف بہ نیاز ہوا تھا۔ جب آپ مسکراتے ہوئے ملاقاتی کمرے میں تشریف لائے تو میں آپ سے کوسوں دور ہو گیا اور یہ محسوس کیا کہ

اک نور کا عالم متواتر ہے نظر میں
مہتاب زمیں پر ہے کہ میں ہوں سر مہتاب

حق تو یہ ہے کہ آپ کی روشن دماغی اور بلند کرداری کا احاطہ الفاظ نہیں کر سکتے۔ آپ نے جس انداز سے کرم فرمایا ہے اُس کا میں احسان مانتا ہوں۔

اور یہی بات محترم ایس، ایم، البشیر رئیس کاپنور پر عائد ہوتی ہے۔ آپ مخلص متین اور محبّ ہر کس و ناکس ہیں۔ زمانے نے انسانیت کو ایسے ہی لوگوں پر ناز کرتے دیکھا ہے۔

نیز قابلِ قدر شری وید پرکاش گپتا مینجنگ ڈائرکٹر "موٹر اینڈ فائننس لمیٹڈ دہلی" کی حوصلہ افزائیوں اور نکتہ دانیوں کا معترف و ممنون ہوں۔ آپ کا اخلاق آپ کی دولت مندی سے کہیں بلند و بالا ہے۔

آخر میں دیباچہ نگار مہربانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خاص طور پر لالہ گنپت رائے پرنٹر، پبلشر "ٹریبون" کے مفید مشوروں کا قائل ہوں کہ آپ نے زیرِ نظر تصنیف کی تدوین و ترتیب میں دستگیری فرمائی ہے۔

بسمل دہلوی

بتا اے پیکرِ گِل تُو نے دُنیا میں کیا کیا ہے

کبھی ڈالی نگاہِ مشفقانہ خستہ جانوں پر؟
کبھی آنکھیں ہوئیں نمناک آشُفتہ بیانوں پر؟
کبھی بابِ عطوفت وا کیا تشنہ دہانوں پر؟
کبھی آیا ترس خاطر زدوں بر بے زبانوں پر؟
کسی عاجز کو بے کس کو سہارا بھی دیا تُو نے؟
کسی مظلُوم کا چاکِ گریباں بھی سیا تُو نے؟

سخن شناس و نکتہ رس

قابلِ تعظیم آچاریہ جگل کِشور

وزیر تعلیم یو، پی گورنمنٹ

کے

نام

بہ افتخار و اعتقاد

بِسمل دہلوی

ACHARYA JUGAL KISHORE

Education Minister :-Uttar Pradesh Govt.

اُمیّد کی ایک کِرَن

بادِ مخالف نے اُردو زبان کی حسینۂ انجمن آرا کے گیسو برہم کر دئے مخالفت کے دستِ درازِ اس کے عُروسانہ سنگار کو مٹانے پر اُٹھ گئے اور سیاسی مصلحت نے اس کے حُسنِ جہاں تاب کو نظروں سے گِرادیا۔ تاہم اس کانِ حلاوت کے دلدادہ اس کے گیسوئے برہم میں شانہ کشی کرنے کے لئے اور اس کی آرائشِ جمال کو زندہ رکھنے کے لئے ابھی کوشاں ہیں۔

مثلاً شری گلزاری لال نندہ لیبر منسٹر حکومت ہند؛
شری متھرا داس ماتھر ہوم منسٹر راجستھان سرکار،
ڈاکٹر دیوراج نارنگ مینجنگ ڈائرکٹر نارنگ برادز،
کیپٹن وید رتن موہن ڈپٹی میئر لکھنؤ۔ پنڈت کنھیا لال مِصر ایڈوکیٹ جنرل یو۔ پی۔ اور
جناب دیوان ہی، مہرہ مل اونر۔ امرت سر۔
یہ حضرات ادب دوست ہی نہیں ادب نواز بھی ہیں اور ذی نظر بھی۔

بسمل دہلوی

کِس قدر ہے تمھیں تعظیمِ خیالِ دشمن
تم سے سیکھے کوئی دلداریٔ مہماں کرنا

ایک لغزش میرے ساقی! اور کر لیتا ہوں میں
آنسوؤں سے آج خالی ظرف بھر لیتا ہوں میں

کُل جہاں کے حادثاتِ جاں گداز و جاں گُسل
جب مُرتّب ہو گئے تو زندگانی بن گئے

ہائے یہ بدذوقیٔ نغمہ سَرایانِ چمن
حادثاتِ عشق بھی اب تو کہانی بن گئے

نقرہ و زر سے اگر طائر کے پَر منڈھ دو گے تُم
طاقتِ پرواز سے محرُوم کر دو گے اُسے
زندگی بھر جو چلا دولت کا دامن تھام کر
زندگی بھر آگ کے دریا میں دیکھو گے اُسے

ہے جام بکف سامنے ساقی جواں سال
اب وسوسۂ گردشِ ایّام نہیں ہے
ظالم! ترے جذبات کو تڑپا کے رہے گی
یہ بسملِ غم دیدہ کی۔ شاعر کی جبیں ہے

۲۱

میں جانتا ہوں ضبط و تحمّل کے معانی
حالات کی غمّاز ہے اشکوں کی روانی
ماحول اگر یاس کی شدّت سے ہو مسموم
ہوتی ہے ستاروں کی چمک سے بھی گرانی

گر سمجھا گیا ہے تو سزاوارِ عنایت
تکمیلِ محبت بھی ہے توہینِ محبت
گر انجمنِ ناز میں پرسش نہیں اے دوست!
پازیب کی جھنکار بھی ہے بارِ سماعت

ترا مقام شوالہ ہے اور نہ کعبہ ہے
نہ تیرا فکرِ غلام روائتِ تقدیر
لباسِ خاک میں اک حسنِ لازوال ہے تو
جبینِ چرخ پہ رخشندہ ہے تری تحریر

مجھے شکستِ محبّت قبول ہے ظالم!
تُو اپنے طرزِ تغافُل پہ شرمسار نہ ہو
کیا ہے موت کا میں نے ہمیشہ استقبال
تُو میرے نزع کے عالم پہ اشکبار نہ ہو

محبت کے تمام ارمان جل کر خاک ہو جائیں
محبت میں کبھی اے سوزِ غم ایسا بھی ہوتا ہے
سرِ مقتل خود استبداد کا چہرہ اُتر جائے
محبت میں اک اندازِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
یہاں تم آتے آتے راستے سے پھر گئے اُس دِن
کسی فُرقت کے مارے پر ستم ایسا بھی ہوتا ہے
تڑپ کر تم حریمِ ناز سے باہر چلے آؤ
جوانی میں جوانی کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

ہو گیا ہوں میں مہ و مہر سے کب کا فارغ
اور ابھی الجھے ہوئے ہیں خس و خاشاک میں لوگ

قیمتِ گریۂ غلطیدہ بخوں کیا جانیں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں تابندہ گہرِ خاک میں لوگ

بسکہ دشوار ہے اندازِ جنوں کی تقلید
کب سے سرگشتہ ہیں ویرانۂ ادراک میں لوگ

میں جانتا ہوں امیرِ ستم شعار کے رنگ
جگر کا خون چھری کی زبان ہوتی ہے

ستم زدوں کو کہاں ہے اجازتِ فریاد
یہ داستان نظر سے بیان ہوتی ہے

شکار گاہِ بشر دیدنی ہے اے بسمل
کہ خون پی کے تمنا جوان ہوتی ہے

زندگی میں طمانیت کا خیال
راہِ تاریک میں بھٹکنا ہے
تیغِ صرصر ہو جس کی گردن پر
خاک اُس غُنچہ کا چٹکنا ہے
اہلِ دولت سے لُطف کی اُمید؟
سنگ و آہن پہ سر پٹکنا ہے
چشمِ حاسد میں عُمر بھر کے لئے
خار بن کر مجھے کھٹکنا ہے

طوفان کچھ ایسا آیا ہے سب اپنی جان کو رو بیٹھے
اب ماتمِ کشتی کیا کیجے دریا کا کنارا ڈوب گیا
میں جس کے اجالے میں پہروں منزل کو نہارا کرتا تھا
آکاش کے ساگر میں بسملؔ اک وہ بھی ستارا ڈوب گیا

۳۰

ساقی! یہ تکلّف ہے حقیقت تو نہیں ہے
شیشے میں نہیں اور تو خُم میں بھی نہیں اور
ہے رنج کسی دل میں تو راحت کسی دل میں
اک حُسن کا جلوہ ہے کہیں اور کہیں اور

ایک حقیقت

کسے مرگِ بسمل کا احساس ہوگا
وہ بیکس بھی تھا اور خوددار بھی تھا

گوارا نہ تھی اُس کو ضبطِ محبت
نمودِ محبت سے انکار بھی تھا

اُسے کچھ شکایت تھی اک نازنیں سے
وہ اسلوبِ دُنیا سے بیزار بھی تھا

تو بدرِ جنوں جس کی طرزِ جفا تھی
اُسی پیکرِ ناز سے پیار بھی تھا

مئے لالہ گوں پر تھی جان اسکی صدقہ
وہ دلدادۂ چشمِ بیمار بھی تھا

جوانی کا اور روپ کا وہ پجاری
عروسِ حیا کا پرستار بھی تھا

وہ آغوشِ دولت میں پیدا ہوا تھا
مگر نامِ دولت سے بیزار بھی تھا

تھی محبوب اُسے عشق کی خودستائی
وہ خاطر زرہ ناز بردار بھی تھا

یہ ہستی تھی اس کے لئے بارِ خاطر
وہ شاعر تھا دانائے اسرار بھی تھا

"خُدا سے"

رِزق تیرے بیکسوں کو مرحمت ہوتا ہے یُوں
جس طرح صحرا میں دو اشکِ سحابِ تنگ ظرف
تیرے بدبختوں کی اُمیدوں کا یُوں بنتا ہے قصر
جس طرح لکھتا چلا جائے کوئی پانی پہ حرف

اِنسانِ عظیم

(یہ نظم ۱۹۶۰ء میں گاندھی جینتی پر پڑھی گئی تھی)

معرفت کا وہ پرستار وہ صاحبِ تقدیس
جس کو کردارِ مُنزّہ کا پیمبر کہیئے
وہ ہر انسان کا محبُوب ہر انسان کا دِل
جس کو بے چارہ و بے حال کا دِلبر کہیئے
وہ محبّت کا پُجاری وہ فلاحت اندیش
منزلِ امن و اماں کا جسے رہبر کہیئے

جاں نثارانِ وطن کا وہ چراغِ روشن

بزمِ انجم کا جسے مہرِ منوّر کہیے

وہ ستم کش وہ جفا کش وہ غریبوں کا انیس

جس کو بھارت کے گلستاں کا مقدّر کہیے

جس کا ہر گام خیابانِ صداقت میں اٹھا عرصۂ ترک میں میدانِ ریاضت میں بڑھا

جس نے بخشی ہے سیاست کو بلند اخلاقی

تیاگ کا اور تپسیا کا اتالیق تھا وہ

حریت جس کے تردّد سے ہوئی جانِ وطن

محرمِ سرِ دروں کشتۂ تحقیق تھا وہ

جس کا ہر سانس تھا عرفاں کا اہنسا کا پیام

غم نصیبوں کے لئے صاحبِ توفیق تھا وہ

اس کا ہر لفظ کلیجے میں اتر جاتا تھا اس کی تدبیر سے ہر کام سنور جاتا تھا

اب شجاعت سے اُنھیں کس کا سہارا لے کر
وہ ارادوں کا دھنی مردِ شجاعت نہ رہا
کس کے سایہ میں تلاطم کو کہیں حرفِ غلط
ہائے۔ وہ صاحب دل خالقِ ہمت نہ رہا
برق سے کس کے اشاروں پر بلا خیز آنکھیں
وہ محرّک وہ علم دارِ شہادت نہ رہا
سینہ چاکانِ وطن کا ہو مداوا کس سے
شافعِ غم نہ رہا جانِ مروّت نہ رہا
آج کس طرح چمن بندی ہو ممنونِ جمال
اہلِ حکمت نہ رہا۔ اہلِ فراست نہ رہا
کس کی تحریکِ جسارت پہ ہوا ب سرتابی
وہ دلِ افگار وہ جاں دادۂ غیرت نہ رہا
کیوں نہ گلشن کا یہ شیرازہ بکھر کر رہ جائے
حق و نصفت کا نہ کیوں چہرہ اتر کر رہ جائے

مارنے والے نے سمجھا نہ یہ رازِ مستور
ایسے حق آفریں کب بارِ دگر آتے ہیں
ماہِ کامل کی چمک صاحبِ دل سے پوچھو
یوں تو بیمار سے بھی تابندہ نظر آتے ہیں

کتنی شدت سے خیالات میں پامالی ہے   آج اِک عرصہ سے باپو کی جگہ خالی ہے

"اِنسانِ کامل"

(راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرساد سے عزت حاصل ہونے پر)

ذرّہ پرواز کرے جانبِ مہرِ خاور
رحمتِ مالک و بیداریٔ قسمت کہیئے

صدرِ جمہوریۂ ہند پہ اُٹھّا ہے قلم
گویا اس نظم کو شاعر کی جسارت کہیئے

مدح پیرائی مرا شیوہ نہیں شغل نہیں
اس تخیّل کو خداداد عقیدت کہیئے

دین کے اور دیانت کے ہیں آپ آئینہ دار
ہے بجا آپ کو گر بندۂ طاعت کہیئے

سادگی آپ کا مسلک ہے صداقت ہے شعار
آپ کو محرمِ اسرارِ حقیقت کہئے
نقش بر آب نہیں آپ کا کردارِ جمیل
کیوں نہ پھر آپ کو حق دارِ فضیلت کہئے
ایسے شائستہ بشر روز کہاں آتے ہیں　　اہلِ دل اہلِ نظر روز کہاں آتے ہیں
معنوی رنگ میں "گیتا" کے مُقلِّد ہیں آپ
آپ باپو کے خیالات سے وابستہ ہیں
قوم کا درد ہے مواج دلِ اقدس میں
جذبِ کامل کی حکایات سے وابستہ ہیں
ہر ادا اور ہر انداز ثبوتِ تکریم
عشق و عرفاں کے مقامات سے وابستہ ہیں
تیاگ سے اور تپسیا سے لگن ہے ازلی
معرفت اور مُناجات سے وابستہ ہیں

جلوۂ وحدت و ناموسِ وطن کے عاشق
اتفاقات و مساوات سے وابستہ ہیں
جان سے شیفتہ ہیں رام کی مریادا پر
کرشن کی خاص ہدایات سے وابستہ ہیں
حق تو یہ ہے کہ یہ اِس منصبِ گردوں آثار
آپ بھارت کی روایات سے وابستہ ہیں

کتنے سوتے ہیں تہِ خاک بیابانوں میں　　کتنے عشاق کے نام آئے ہیں دیوانوں میں

منصب و جاہ پہ موقوف نہیں ہے سب کچھ
عزّ و تعظیم و فضیلت کا سبب اور ہی ہے
منصب و جاہ کی قسمت میں کہاں عمرِ دوام
آپ کی برکت و عظمت کا سبب اور ہی ہے

آپ وہ ہیں کہ جنھیں سوزِ نوا ہی محبوب　　درد میں ڈوبے ہوئے دل کی صدا ہی محبوب

"پیامِ لاکلام"

عظمت نہ اپنی آپ جتانا کبھی یہاں
حرفِ ریا زباں پہ نہ لانا کبھی یہاں
رکھنا تمام عُمر یہاں سادگی سے کام
سر کرنا پائے اقدسِ مرشد پہ خم مُدام
ایذا نہ کوئی دینا کسی جان دار کو
کرنا معاف پیار سے تقصیر وار کو
یُوں رہ کے پاک و صاف علوئے صفات میں
رکھنا ہمیشہ آپ پہ قابُو حیات میں

بھگوان مہاویر

(یہ نظم ۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو دہلی میں زیرِ صدارت راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرساد پڑھی گئی تھی)

مجھ سے تعریفِ مقاماتِ فضیلت کیا ہو
معصیت کیش سے اظہارِ عقیدت کیا ہو
فرطِ جذبات سے رہوارِ قلم رُکتا ہے
سر اُٹھاتا ہوں تو تعظیم سے سر جھکتا ہے
وہ کہ خود مالکِ برتر بھی ہے شیدا جس پر
دونوں عالم کے ہوئے راز ہویدا جس پر
کہکشاں جس کے لئے عرش پہ تعمیر ہوئی
جس کے کردار کی ہر گام پہ توقیر ہوئی

چاند تاروں کو عطا کی ہے چمک جس کے لئے
سنگ و آہن میں نمایاں ہی لچک جس کے لئے

نوجوانی میں جو سرگشتۂ تحقیق ہوا
اور تقدیسِ عمل کا جو اتالیق ہوا

ہر نفس جس کو اہنسا کا پیمبر کہئے
عہدِ تیرہ کا جسے مہرِ منوّر کہئے

راہِ عرفاں میں ہر آرام کو ٹھکرا کے چلا
خوبئ ترکِ موالات کو سمجھا کے چلا

جس کی تعلیم سے روشن ہوئے اسرارِ حیات
جس کی کاوش نے معیّن کئے اطوارِ حیات

رُوح کو جس نے سنوارا ہے نکھارا ہے مدام
نُور ہی نُور کو سینے میں اُتارا ہے مدام

اس کی سیرت کسی انساں سے بیاں کیا ہوگی
دل میں جو شکل نہاں ہو وہ عیاں کیا ہوگی
یوں تو تاریخ میں اسبابِ اثر اور بھی ہیں
اہلِ دل اور بھی ہیں اہلِ نظر اور بھی ہیں
لیکن ایسا کہیں پیدا ہے نہ پیدا ہوگا
رازِ مستور بھلا کس پہ ہویدا ہوگا

اے دوست!

تری سرشت میں مُضمر ہے گرمیٔ پرواز
فلک کے چاند ستاروں کو چُوم لے اُٹھ کر

ادائے فطرتِ معصوم کی نہ کر توہین
ضیا فروز نظاروں کو چُوم لے اُٹھ کر

ترے شعور پہ حاوی ہے کیوں غمِ فردا
نظر نواز بہاروں کو چُوم لے اُٹھ کر

نگاہِ عشق میں یہ امتیاز کیسا ہے؟
گلوں کی بزم میں خاروں کو چُوم لے اُٹھ کر

کہاں کہاں سے وہ ہو کر گئے ہیں کیا معلوم
تمام راہگذاروں کو چُوم لے اُٹھ کر

ستاروں کی ضیا بن کر فرشتوں کا سلام آیا
زبانِ بسملِ وارفتہ پر جب اُن کا نام آیا

دو عالم نور میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
بھری محفل میں کیا بے پردہ وہ ماہِ تمام آیا

رہا ہوں پا بہ آتش ہو کے زندانِ عناصر میں
خدا کا شکر ہے - میری رہائی کا پیام آیا

مجھے دُشوار ہو گا ہنستے ہنستے جان دے دینا
دمِ آخر اگر وہ آئے یا اُن کا پیام آیا

وہ پابندِ محبت ہو گئے اُٹھتی جوانی میں
جواں ہو گئی آسودہ جب اُن کا سلام آیا

ترے حسنِ نظر کا کیا یہی معیار ہے ساقی!
کبھی ہم کو نہ اپنایا کبھی ہم تک نہ جام آیا

ہزاروں آفتاب آنکھوں کے آگے کانپ کانپ اُٹھے
یہ کس کا ذکر آیا بزم میں یہ کس کا نام آیا

نہ وہ شورِ سلاسل ہے نہ وہ زورِ جنوں ہمدم!
ہماری زندگی کا آفتاب اب زیرِ بام آیا

میں آخر موت کا کب تک رہوں شرمندۂ احساں
نہ وہ آئے نہ اب تک اُن کے آنے کا پیام آیا

ہوئی مجھ سے نہ تسکینِ غمِ پنہاں بھی اے بسمل
مری ہستی کا شیرازہ کسی کے بھی نہ کام آیا

شبابِ نَو دمیدہ پر فدا ہونے کا وقت آیا
خُدا کے نام سے نا آشنا ہونے کا وقت آیا
تری زُلفوں کے سایہ سے جُدا ہونے کا وقت آیا
پھر اپنے بخت پر ماتم سرا ہونے کا وقت آیا
اسیرانِ قفس نغمہ سرا ہونے کا وقت آیا
وہ مَوت آئی وہ ہستی سے رہا ہونے کا وقت آیا
نویدِ وصل دینا وہ مجُھے پلکوں کے سایہ میں
دو عالم کی حدوں سے ماوَرا ہونے کا وقت آیا

قدم کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر کچھ بہکی بہکی سی
شباب آیا ہے یا محشر بپا ہونے کا وقت آیا
مرے پہلو میں وہ انگڑائی لے کر کسمسا اُٹھے
سراپا دل۔ سراسر مُدعا ہونے کا وقت آیا
مسیحا سر جُھکا کر اُٹھ گیا بسمل کی بالیں سے
خُدا حافظ۔ کہ اب محوِ دُعا ہونے کا وقت آیا

غزل

کبھی ہمنوا کی تلاش ہے کبھی ہم سفر کی تلاش ہے
مگر اِس تلاش کے نام پر ترے سنگِ در کی تلاش ہے

غمِ دو جہاں کی ندائی سے جو مذاق کر کے پلٹ گئی
مجھے اِس فضائے مجاز میں پھر اُسی نظر کی تلاش ہے

جو تلاطموں پہ نثار ہو جو تموّجوں پہ فدا رہے
جو خدا سے بھی نہ ہو ملتجی مجھے اُس بشر کی تلاش ہے

ہے مزاجِ عشق ابھی منتشر ابھی برہمی ہے جنون میں
کبھی دردِ دل کا ہوں معترف کبھی چارہ گر کی تلاش ہے

یہ حیات کوئی حیات ہے جو طلوع ہو کے غروب ہو
نہ ہو شام جس کی تلاش ہیں مجھے اُس سحر کی تلاش ہے

مجھے پاسِ عزّتِ عشق ہے میں امینِ جلوۂ حُسن ہوں
یہ سخن زباں پہ نہ آئے گا تری رہگذر کی تلاش ہے

ہے نگاہ بس ترے حُسن پر تو مرا عشق ہے مری زندگی
نہ مجھے خدا کی تلاش ہے نہ خُدا کے گھر کی تلاش ہے

مرا ساتھ دے جو تُو عشق میں تو ترِی نوازشِ بیکراں
میں بھٹک گیا تری راہ سے مجھے راہبر کی تلاش ہے

یہ نمی ہے کس لئے آنکھ میں یہ نگاہ کیوں ہے جھُکی ہوئی
ترے غم کا شکوہ ہو کیوں مجھے مری عمر بھر کی تلاش ہے

غزل

دل آئینہ تمثال ہو گر سوزِ یقیں سے
سجدوں کا تعلق رہے در سے نہ جبیں سے

آدابِ محبّت میں نمائش نہیں داخل
سجدوں کے نشاں مِٹ گئے لوحِ جبیں سے

ہستی کے مقامات ہوئے غیب سے روشن
ہستی پہ نظر کی جو کبھی اُٹھ کے زمیں سے

موجوں نے بلندی کی طرف رُخ تو کیا ہے
تاہم ہیں بہت دُور ابھی ماہِ مُبیں سے

دیکھے تو کوئی آگ کے دریا میں اُتر کر
تکمیلِ محبّت کا ہے آغاز یہیں سے

دُنیا کو کہاں معرفتِ گردشِ دوراں
ٹکرائیں گے یہ ذرّے کبھی عرشِ بریں سے

ہر جلوہ نگاہوں میں تڑپنے کو ہے بیتاب
یہ بات ہوئی آئینہ اک گوشہ نشیں سے

رکھا ہے قدم چودھویں منزل میں اُنھوں نے
لے آئے کوئی شمس و قمر چرخ بریں سے

بسمل ہیں اُنہیں دوڑ کے سینے سے لگا لوں
اے کاش۔ وہ آتے ہوئے مل جائیں کہیں سے

یارب!

تُو ہی بتا! کہ کبھی انکشافِ راز کیا؟
تری جناب میں دستِ طلب دراز کیا؟

میں آج عُمر میں پہلا سوال کرتا ہُوں
تو میری قوم کو آبِ گہر عطا کر دے
زوال کو تُو بدل دے عرُوج میں یارب!
دلِ فسردہ کو برق و شرر عطا کر دے
رہے گی فکر و عمل پر غنود گی کب تک
شبِ سیاہ کو نُورِ سحر عطا کر دے

مرے وطن کو نہیں احتیاجِ چنگ و رباب
گدازِ خاطر و سوزِ جگر عطا کردے

یہ نوجوان مری قوم کے محافظ ہیں
انھیں تو بُرشِ تیغِ دو سر عطا کردے

سکونِ دل تو ہے یارب! اجل کا دوسرا نام
سکونِ دل کو تو عمرِ شرر عطا کردے

قیام میں بھی رہتی ہے گرمیٔ کردار
فراقِ منزل و ذوقِ سفر عطا کردے

بس۔ آج تجھ سے میں اتنا سوال کرتا ہوں
تو میری قوم کو حسنِ نظر عطا کردے

وگرنہ۔ میں نے کبھی التجا پہ ناز کیا؟
تیری جناب میں دستِ طلب دراز کیا؟

غزل

وہ پیشِ نظر تو تھے لیکن۔ آغوشِ نظر میں آ نہ سکے
منزل پہ پہنچ کر بھی ہمدم! میں سینکڑوں منزل دور رہا

آغوشِ سکونِ کامل میں تالیفِ جسارت کیا ہوتی
احسان ہے گردش کا مجھ پر طوفان سے ساحل دور رہا

دیدار کی ہمت ہو نہ سکی۔ تقریر کی جرأت کر نہ سکے
ہر رنگ میں اہلِ محفل سے وہ زینتِ محفل دُور رہا

اے فرضِ محبت! شانِ وفا! یہ کیا اعجاز نمائی ہے
خمیازۂ قیدِ سلاسل سے پابندِ سلاسل دُور رہا

شائستہ مزاجوں کو دُنیا کب چین سے جینے دیتی ہے
یہ فیض ہے بادہ پرستی کا دُنیا سے بسملؔ دُور رہا

غزل

یہ تجھ کو حسرتِ تعمیرِ آشیاں کیوں ہے؟
تُو محوِ سلسلۂ سعیٔ رائگاں کیوں ہے؟

کل اپنی کوششِ احسن پہ ناز تھا تجھ کو
یہ آج ماتمِ تخریبِ آشیاں کیوں ہے

نظر بھی کیوں ہے شریکِ جمالِ روئے دوست
یہ اِک لطیف سا پردہ بھی درمیاں کیوں ہے

یہ زندگی ہے کسی معصیت کا خمیازہ
تُو اس دیار میں شرمندۂ فغاں کیوں ہے

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں آج تک بسمل
مرے نصیب میں اندوہِ جاوداں کیوں ہے

فلسفۂ حُسن و عشق

تُو نے دستورِ محبّت کا اڑایا ہے مذاق
کیا یہ وحشت تیری روداد کی غمّاز نہیں

دل منوّر ہے۔ مگر۔ سوزِ دروں سے محروم
فکر زندہ ہے۔ مگر۔ مائلِ پرواز نہیں

حُسن غلطیدۂ دریائے تحیّر کیوں ہے
سینۂ عشق میں پوشیدہ کوئی راز نہیں

یوں تو وہ جلوہ گہِ ناز سے باہر آجائیں
جذبۂ درد میں ڈوبی ہوئی آواز نہیں

خود فریبی میں گرفتار نہیں ہے بسمل
کیا یہ تخلیق برائے نگہِ ناز نہیں

کام ادنیٰ سے بھی اعلیٰ کے نکل جاتے ہیں
ہم نے خُم بھرتے ہوئے دیکھا ہے پیمانے سے

غزل

حاصلِ فردوس تو ہو جائے ویرانہ ابھی
مائلِ گریہ نہیں ہے تیرا دیوانہ ابھی

ختم تو ہو جائے کفرِ امتیازاتِ نظر
لوگ ہیں نامحرمِ آدابِ میخانہ ابھی

میں بدل تو دوں زمانے کا یہ فرسودہ نظام
مجھ تک آیا ہی نہیں اے دوست پیمانہ ابھی

آگ میں جل کر وصالِ دوست ہوتا ہے نصیب
ہے طوافِ شمع میں مصروف پروانہ ابھی

عشق کامرکز کہاں اور دشت پیمائی کہاں
اپنی منزل سے بہت پیچھے ہے دیوانہ ابھی

ٹوٹنے پائے نہ یارب! آنسوؤں کا سلسلہ
نامکمل ہے غمِ عاشق کا افسانہ ابھی

ہوش آتے ہی میں کس ظلمت کدے میں آگیا
تھا قریبِ ماہ و انجم میرا کاشانہ ابھی

لب پہ آئی بات کہہ تو دوں مگر سمجھے گا کون
ایک عالَم ہے سخن فہمی سے بیگانہ ابھی

آج تشنہ رہ نہ جائے بسملؔ صہبا پرست
رات باقی ہے ابھی رقصاں ہے پیمانہ ابھی

"شہیدِ اعظم"

(یہ نظم سردار بھگت سنگھ کے یوم شہادت پر پڑھی گئی)

اے ستم کشتۂ افرنگ! تجھے میرا سلام
فاتحِ عرصۂ صد رنگ! تجھے میرا سلام
فطرتاً مردِ مجاہد تھا تو۔ آزاد تھا تو
قلبِ دشمن کے لئے ناوکِ فولاد تھا تو
تیرے ایثار نے بدلی ہے وطن کی تقدیر
آج تاریخِ شہادت میں نہیں تیری نظیر
تو نے اس طرح کیا چاک گریبانِ ستم
ایک عالم تجھے کہہ اُٹھا شہیدِ اعظم

یُوں تو قربان ہوئے اور ہزاروں جی دار
اور لاکھوں نے دلیری سے اُٹھائے آزار
لیکن اے جانِ وطن! تیرا جگرا اور ہی تھا
تیری خوں گشتہ شہادت کا اثر اور ہی تھا
ایسے خود دار بشر روز کہاں آتے ہیں
اہلِ دل اہلِ نظر روز کہاں آتے ہیں
ہائے بجلی نہ گری تیرے ستمگاروں پر
سر پہ تلوار تھی اور پانوں تھے انگاروں پر
سر فروشانِ وطن میں تُو ہی سرِدار رہا
دیش کا بھگت رہا قافلہ سالار رہا
نعمہ بیرا تھا تُو انگریز کی جلّادی پر
تیرے کردار کا احسان ہے آزادی پر

نوجواں تیری شہادت کی قسم کھائینگے
حشر تک شانِ بغاوت کی قسم کھائینگے

اخلاقِ حاضر

افسانہ ہو گیا ہے آئینِ فیضِ شبنم
پنہاں ہے جس میں مطلب کارِ اہم ہے اب وہ
آنکھیں ہیں اشک ساماں لیکن بہ جوشِ محبت
دل تک نہ جو رسا ہو احساسِ غم ہے اب وہ
ہلکی سی مسکراہٹ مکر و ریا کی حامل
باہم دگر نمایاں رنگِ کرم ہے اب وہ

ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی

(یہ قطعات امرت سر میں پڑھے گئے تھے)

موت کی نیند سو گیا تو بھی
ہو گیا قوم سے جدا تو بھی
کیسے آئیگی بیکسوں میں حیات
شیر بنگال! چل دیا تو بھی

خواب سے کون اب جگائے گا
کون پیغام زیست لائے گا
جس نے ٹکرایا سر پہاڑوں سے
ایسا رہبر کہاں سے آئے گا

شافعِ غم بنا کرے کوئی کشتۂ غم ہوا کرے کوئی
راہ بھی تھا تُو راہبر بھی تھا تیری تعریف کیا کرے کوئی

تُو مقدّر پہ مُسکراتا تھا اور رگِ جاں پہ گیت گاتا تھا
تیرتا تھا لہُو کے دریا میں بجلیوں سے نظر ملاتا تھا

مُردگی سے حذر کیا تُو نے زندگی کو اَمر کیا تُو نے
کھا گئی تجھ کو وادیٔ کشمیر ہائے کس دن سفر کیا تُو نے

نظامِ امارت

دُنیا کو چلانا ہے گر اپنے اِشاروں پر
اربابِ امارت سے سیکھو تُم اداکاری
اخلاص و امانت سے پرہیز انھیں دائم
رہتی ہے تبسّم تک محدُود وفاداری
ہمدردی و ہمدستی اِن میں نظر آئیں کیا
پیشہ ہے ریاکاری شیوہ ہے دل آزاری

غزل

ساقی! رُخِ حیات سے پردہ اُٹھا دیا
جامِ سفال ہیں یہ مجھے کیا پلا دیا
بسمل ہی تھا جو وقتِ اَجل مُسکرا دیا
دُنیا کو اُس کی مَوت نے جینا سِکھا دیا
اِک سوزِ نا تمام اِک اندوہِ بے ثبات
اے رحمتِ تمام! بتا! مجھ کو کیا دیا
ہم نے نہیں تو کِس نے نظر کو زبان دی
حالِ زبُوں کہا نہ گیا اور سُنا دیا

وہ خود شراب لے کے بڑھیں خود کہیں کہ پی
بے صبر! تُو نے کس لئے ساغر بڑھا دیا
ساقی! تری ادا کی قسم چُوک ہو گئی
دیکھا جو التفات تو ساغر بڑھا دیا
ہم سے کِسی کے عشق میں یہ تو نہیں ہوا
ہر آستاں پہ سجدہ کیا سر جُھکا دیا
بسمل کی موت کا جو کوئی لے گیا پیام
مُنہ سے تو کچھ وہ کہہ نہ سکے سر جُھکا دیا

منشی پریم چند

(یہ نظم یومِ وفات پر لال قلعہ میں پڑھی گئی)

اے سراپا سوز! نبّاضِ چمن! فطرت نگار!
رُوح کی پاکیزگی تھی تیرے ہر کردار میں
تُو رواں تھا کوچہ کوچہ۔ قریہ قریہ شہر شہر
اور گوشہ گیر بھی تھا محفلِ دلدار میں
جدّتِ حُسنِ بیاں پر حُکمرانی تھی تری
خیمہ زن تھا تُو ادب کے عالمِ بیدار میں
کون سا مضموں تھا جو تیری قلمرو میں نہ تھا
سر اُٹھایا کس تخیّل نے ترے دربار میں

تیری جولانی کا گرویدہ تھا ہر فکرِ جمیل
غرق تھا ہر نکتہ تیری شوخیٔ اظہار میں
اور تو گرویدۂ اخلاص بھی ایسا رہا
رنگِ روئے گل نظر آیا لباسِ خار میں
اِک تبسّم اک نظر یادِ مخالف کا جواب
شانِ بحرِ بے کراں تھی خاطرِ غم خوار میں
آج تو ہم سے جُدا ہے گلشنِ جنّت میں ہے
ماورائے حدِّ غم ہے پُر سکوں حالت میں ہے
ہر برس برسی مناتا ہے ترا پیارا وطن
وہ ترا پیارا وطن "فخرِ جہاں ہندوستاں"
جس نے تیری غم نوائی کا اُڑایا تھا مذاق
جس نے تیرے صبرِ پیہم کا لیا تھا امتحاں

جس کے ہر شعبہ میں ہے مُردہ پرستی کا رواج
خُوں چشیدہ ہے جہاں سرمایہ داری کی زباں
جس کا دل مصنوعی شیون سے شکستہ ہے مُدام
چشمِ ظاہر بیں سے آبِ خشک بہتا ہے جہاں
بے دیائی ہے جہاں لفظِ تمسخُر آفریں
سجدہ گاہِ رافتِ باطل ہے جس کا آستاں
جس کی چھاتی پر ادب کوہِ گراں سے کم نہیں
فکر مہمل۔ شاعری مضمونِ ناقص ہے جہاں
زندگی بھر جس کے شاعر ایڑیاں رگڑا کیے
تُو اسی "پیارے" وطن کے حال پر تھا نوحہ خواں
اہلِ زر اہلِ سخن کی قدر کر سکتے نہیں
رُوح کی گہرائی میں غافل اُتر سکتے نہیں

میکدہ آباد تھا جن سے وہ میکش اُٹھ گئے
ظالمو! اب یادگاریں شوق سے قائم کرو
ایک مدت سے تمہارا ہو چکا مُردہ ضمیر
حسرتوں کی چھانوں میں نوحے پڑھو۔ ماتم کرو
منکشف ہے مجھ پہ اہلِ زر کی سرکوبی کا راز
غم زدوں پر اپنی چشمِ بے حیا پُرنم کرو
لیڈری کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے
روز و شب آہیں بھرو۔ صدمے اٹھاؤ۔ غم کرو
کھیلتا آتا ہے تُم کو قوم کے جذبات سے
نالہ زن ہر دم رہو۔ چشمِ تلطّف کم کرو
سادہ لوحی سے مُرادف ہے تمنّائے عمل
تُم علاجِ درد کا وعدہ کرو۔ مُبہم کرو

تُم وطن کے پاسباں ہو گیا ہے کم احسان یہ
بیکسوں پر شاطرانہ لُطف کیوں پیہم کرو

رہزنوں کی آنکھ میں توقیرِ اضمحلال کیا
شاعروں کی زندگی کیا شاعروں کا حال کیا

اے ادیبِ دُور رس! اے محرمِ رازِ نہاں
درحقیقت یہ خرابستاں ترے قابل نہ تھا

مضمحل ہوتے رہے تجھ سے زمانے کے فریب
اہلِ محفل کے لئے تُو رونقِ محفل نہ تھا

کیوں نہ سمجھوں میں تجھے سبز اخترِ فرخندہ بخت
اعتبارِ عمر سے تُو ہمسرِ بسمل نہ تھا

اے مرے ہم دم! سپئے دانائے اسرارِ حیات
ہے درازیٔ حیات اس مُلک میں بارِ حیات

ہم آبشار کی شانِ جمیل کیا دیکھیں
کہ وہ بلندی سے پستی میں آکے گرتا ہے
نظر نواز ہے فوارۂ سبق آموز
کہ اُس میں شوخیٔ پرواز کار فرما ہے

غزل

بسمل! اُس جانِ تمنا پر اظہارِ تمنا کیا کیجے
وہ حُسنِ سراپا ہوش رُبا۔ دلدار بھی ہے قاتل بھی ہے

دستُورِ حیاتِ عالم سے حاصل ہے سکونِ دل مجھ کو
اربابِ نظر کے پیشِ نظر طُوفان بھی ہے ساحل بھی ہے

ادراک تو ہے تفسیرِ عمل۔ ادراک سے حاصل کیا ہوگا
جو سوزِ نہاں میں غرق رہے پہلُو میں ترے وہ دل بھی ہے

اے ہوش و خرد کے متوالے! کردار نہیں تو کچُھ بھی نہیں
تقدیر پہ غالب آجانا آسان بھی ہے مشکل بھی ہے

نقّاش بھی ہے محبُوب مجھے اور نقش بھی ہے محبوب مجھے
منظُورِ نظر لیلیٰ بھی ہے منظورِ نظر محمل بھی ہے
اے توبہ شکن! اے جانِ ادا! پینے دے مجھے جینے دے مجھے
پیمانہ ابھی لبریز بھی ہے۔ بیدار ابھی محفل بھی ہے
اُس محرمِ فطرت کو ظالم! تُو کیا سمجھے تُو کیا جانے
عاشق بھی ہے وہ میخوار بھی ہے شاعر بھی ہے وہ بسمل بھی ہے

حاصلِ عشق

تباہ ہونے نہ دے آنسوؤں کا سرمایہ
جلا چراغ تو سوزِ یقینِ کامل سے
جنونِ عشق نہیں ہے تو زندگی کیا ہے
جنونِ عشق ہے قائم فراقِ منزل سے
تو مضطرب تو ہے گہوارۂ تلاطم میں
وجودِ حسن نہ فنا ہو وصالِ ساحل سے
نہ دیکھ حرماں نصیبوں کی آبلہ پائی
کہ خون اُبلتا ہے ہر حلقۂ سلاسل سے
یہ غم نصیب بھی جو اُٹھ گیا تو کیا ہوگا
غمِ دوام میں اب زندگی ہے مشکل سے

ساقی کی نظر کو کیا کہئے اپنا ہی مقدر کھوٹا ہے
ورنہ اس محفلِ امکاں میں کیا بادہ نہیں کیا جام نہیں

ہم کچھ نہ کہیں۔ آہیں نہ بھریں اور حسن تڑپ کر رہ جائے
یہ کارِ جنونِ کامل ہے۔ کچھ سعئ جنونِ خام نہیں

"تعمیر کے نئے زاوئے"

اے کاش! ہو مشاہدۂ حُسنِ بیکراں
رُوئے نقاب پوش کو عُریاں کئے بغیر
تاریکئ زوال کہاں ہو گی منتشر
ہر شمعِ انجمن کو فروزاں کئے بغیر
وحشت رہے گی چشمِ عرُوسِ بہار میں
کانٹوں کو ہم شبیہہ گلستاں کئے بغیر
ناقص رہے گی زینتِ بزمِ طرب نواز
ذرّوں کو آفتابِ درخشاں کئے بغیر

محسوس کیجئے گا کبھی لذّتِ حیات
دُشواریٔ حیات کو آساں کئے بغیر
رحمت کی التجا ہے بصیرت کی خودکُشی
چارہ گریٔ تنگیٔ داماں کئے بغیر
ہے وجہِ افتخار حصُولِ مقامِ عشق
دستِ جُنوں کو صرفِ گریباں کئے بغیر
حُسنِ تمام زینتِ بزمِ خیال ہو
شیرازۂ خیال پریشاں کئے بغیر
اظہارِ حال مُوجبِ توہینِ عشق ہے
ضبطِ فغاں خلاصۂ آئینِ عشق ہے

"آدابِ جنوں"

ہے بے نیازِ سجدہ درِ کعبۂ جمال
لیکن میں اپنے ذوقِ ارادت کو کیا کروں

اظہارِ تشنگیٔ محبت گناہ ہے
احساسِ بے پناہِ محبت کو کیا کروں

وہ کج ادا سہی۔ وہ حریفِ وفا سہی
تسخیرِ تابناکیٔ صورت کو کیا کروں

سفّاک کہہ تو دوں میں سرِ انجمن اُسے
آدابِ بارگاہِ محبت کو کیا کروں

کچھ اُس کے التفات کی صورت نکل تو آئے
میں اپنی خود شناس طبیعت کو کیا کروں

مانا کہ شب کی دُوسری کروٹ ہے روشنی
مایُوسیٔ خیالِ مسرت کو کیا کروں

نازو نیاز لازم و ملزُوم ہی سہی
میں کائناتِ عشق کی حُرمت کو کیا کروں

منّت کشیٔ وصل میں بھی اِنفعال ہے
کیسا بھی ہو سوال مگر پھر سوال ہے

غزل

میں اس گلستاں کی پتی پتی خزاں کے پنجوں میں دیکھتا ہوں
کہاں اکٹھے کئے ہیں تنکے۔ کہاں نشیمن بنا رہا ہوں
حقیقتِ کائنات کیا ہے۔ سمجھ چکا ہوں سمجھ گیا ہوں
ابھی سے کافر بدل گئی ہے ابھی تو ساغر اٹھا رہا ہوں
خدا کی یہ زرپرست دنیا مرادفِ چشمِ تنگ دل ہے
یہ اہتمامِ شرابِ رنگیں اک اور دنیا بنا رہا ہوں
یہ برکتِ بیخودیِ کامل ارے خدا کی پناہ ساقی
شراب کا ایک جرعہ پی کر تمام عالم پہ چھا گیا ہوں

بہ اعتبارِ نگاہِ بخشش تباہِ جامِ شراب ہوں میں
مجھے سمجھنا نہیں ہے آساں۔ میں ظلِّ رحمت میں آگیا ہوں
مرا تصوّر اسیرِ صہبا۔ مرا تخیّل رہینِ ساغر
میں سوئے کعبہ بھی گر چلا ہوں تو لڑکھڑاتا ہوا چلا ہوں
میں سر بہ سجدہ ہوں اُن کے در پر دہ ہچکی آکر اٹھا رہے ہیں
یہ میری لغزش حسین لغزش۔ شراب پی کر کہاں گرا ہوں
میں ایک دریائے بے کراں ہوں مگر بچشمِ عتابِ ساقی
اسیرِ زندانِ جسم ہو کر حدِ تعیّن میں آگیا ہوں
ذرا خبر تو ہو میکشوں کو ہے کتنا ظرفِ نگاہِ رحمت
پیالہ مُنہ سے لگا کے بِسمل میں آج سُوئے حرم چلا ہوں

۸۵

محبّت ایک ایسا جذبۂ پاکیزہ ہے بسمل
کہ جھک جاتی ہے خالق کی جبیں اس آستانے پر

مرنے والے نے آخری دم تک
آپ کو بار بار یاد کیا
میری سب سے بڑی خطا یہ ہے
لطفِ یزداں پر اعتماد کیا
جس نے ٹھوکر لگائی دُنیا کو
اہلِ دُنیا نے اُس کو یاد کیا

"اندھوں کی جھولیاں بھر دو"

یہ نظم ۱۹۶۱ء کو سردار ہرکشن سنگھ اچھریجہ ڈپٹی کمشنر امرت سر کی فرمائش پر اندھوں کی امداد کے لیے امرتسر کے ایک عظیم جلسہ میں پڑھی گئی تھی

شبِ سیاہ کے سینے سے پھوٹتی ہے سحر
یہ واقعہ ہے کہ گدڑی میں لعل ہوتے ہیں
نہیں ہے صاحبِ توفیق پر ہی کچھ مبنی
ستم نصیب بھی اہلِ کمال ہوتے ہیں

لباسِ نور ہی میں کچھ ملک صفات نہیں
کہ خاک میں بھی فرشتہ خصال ہوتے ہیں
چراغ قصرِ مرصّع کے ہی نہیں روشن
کہ جھونپڑی میں بھی روشن خیال ہوتے ہیں
سرِ عدالتِ عالم گواہ ہے تاریخ
اندھیرے گھر میں بھی صاحب جمال ہوتے ہیں
فرانس کے ہی اس اہلِ کمال کو لے لو
کہ موچی زادے بھی کیا بےمثال ہوتے ہیں
ہے آج بریل کا یومِ ولادتِ مسعود
نہ سمجھیں کیوں اِسے ہم اپنی منزلِ مقصود
ہے جدّ و جہد حیاتِ جمیل کی شہراہ
ہے غور و فکر حیاتِ عظیم کی منزل

جو اس حقیقتِ عُریاں سے ہو گیا واقف
اُسی کی آنکھ سے اُٹھتا ہے پردۂ حائل
جو ذرّے ذرّے کو سمجھا ہے روکشِ خورشید
وہی ہے حاصلِ تخلیق و زینتِ محفل

یہ کائنات جہنّم ہے اور جنّت بھی
بساطِ غم بھی ہے۔ گہوارۂ مسرّت بھی

یہ بات کتنی اہم کتنی رُوح پرور ہے
برائے خویش مخیّر جیا نہیں کرتے
قدم قدم پہ تغیّر پذیر ہے عالم
کسی کے حالِ زبوں پر ہنسا نہیں کرتے
گرے ہوؤں کو اٹھا لو۔ اُٹھا کے اپنا لو
کہ مردِ نیک کسی سے کھنچا نہیں کرتے

مہیب موت کا سایہ ہے ہر قدم کیساتھ
اسیرِ دامِ خصومت ہوا نہیں کرتے

رفاہِ عام کے جذبے کو شعلہ زن کردو
تم آنکھ والے ہو اندھوں کی جھولیاں بھر دو

چراغ اندھیرے میں جلتے ہیں روشنی میں نہیں
ہمیشہ لطف و کرم بےبسوں پہ ہوتے ہیں

پگھل گئے ہیں غریبوں کی آہ سے پتھر
جو سنگ دل ہیں وہ انجام کار روتے ہیں

نہ کور چشم ہو یارب! کوئی زمانے میں
لگے نہ آگ کسی کے بھی آشیانے میں

غزل

نشانہ باندھ کر جو تیر اندازی نہیں کرتے
وہ تیر انداز۔ ارے توبہ۔ بڑے چالاک ہوتے ہیں

مآل اندیش ہونا اور جوانی میں؟ معاذ اللہ
وہ اہلِ دل نہیں ہوتے جو ذی ادراک ہوتے ہیں

خدا کا خوف یا زاہد کو یا زردار کو ہوگا
شرابی اِس سے مستغنی ہیں وہ بیباک ہوتے ہیں

ہم ایسے دردمند دل سے خدا کو واسطہ کیا ہے
خدا کے خاص بندے صاحبِ املاک ہوتے ہیں

یہ رُوم و مصر سے پُوچھو۔ عرب سے چین سے پوچھو
پرستارانِ مذہب کس قدر سفّاک ہوتے ہیں

یہ دھوکا ہی سہی۔ لیکن میں اس دھوکے پہ مرتا ہوں
مری آزردگی پر اور وہ نم ناک ہوتے ہیں

بہارِ گلشنِ عالم کے پردے میں تمھیں تم ہو
تمھاری مسکراہٹ پر گریباں چاک ہوتے ہیں

بھروسہ کر نہ اُن کی خندہ پیشانی پہ اے ہمدم!
ازل سے خوں چشیدہ صاحبِ املاک ہوتے ہیں

جوانی میں طبیعت آ ہی جاتی ہے مگر۔ بسمل
یہ مہ پیکر یہ گُل پیکر بہت سفّاک ہوتے ہیں

اے سادہ لوح!

ختم ہو جائے گا دَولت کا نظامِ حق فریب
درگہِ دَولت میں عرضِ تلخیٔ عسرت نہ کر
ٹُوٹ جائے گا طلسمِ شوکتِ اخلاق سوز
طاقتِ احساس کو شرمندۂ منّت نہ کر
بندۂ دستِ کرم ہوتا ہے ننگِ اقتدار
اشک آلودہ کبھی تُو دیدۂ جُرأت نہ کر

"بزرگانِ کرام سے"

یہ دستار و جُبّہ یہ زنّار و قشقہ
ہیں انسانیت کے لئے زہرِ قاتل
مجھے کوئی ذی ہوش اِتنا بتا دے
مذاہب کی دوکانداری سے حاصل
عبادت نُمائی عبادت نہیں ہے
نہ دریا ہے دریا۔ نہ ساحل ہے ساحل

غزل

کب تک رہوں میں کُشتۂ آدابِ کہن اور
اب وضع کیا جائے گا آئینِ چمن اور

آہوں کو ذرا تیز کریں اہلِ محن اور
بدلیں گے روِش ایک دن اربابِ چمن اور

وہ حُسن کا انداز ہے۔ یہ عشق کی تعریف
ہوتے ہیں غضبناک تو بڑھتی ہے لگن اور

فریاد کی لَے غم کی فضاؤں میں سمو دے
آئے نہ کہیں حُسن کے ماتھے پہ شکن اور

بخشی ہے جنُوں کو ترے تسکیں نے فراست
اُس محرمِ فطرت کا ہے اندازِ سخن اور

کسی کے ستم اِس قدر یاد آئے
زباں رُک گئی "مہرباں" کہتے کہتے
کنارے پہ ڈُوبا ہے میرا سفینہ
"نہیں" کہہ گئے آپ "ہاں" کہتے کہتے

انگڑائی لے کے ناز سے بل کھا کے رہ گئے
اپنی نظر میں آپ وہ شرما کے رہ گئے

غزل

ہم ترے ہر راز سے محرم رہے
خوش رہے گو مبتلائے غم رہے

جب تک اس باغ جہاں میں ہم رہے
مبتلائے آفتِ پیہم رہے

ہم بنے ہیں تختۂ مشقِ ستم
امتحاں گاہِ وفا میں ہم رہے

فصلِ گل میں بھی رہا خوفِ خزاں
ہم بہر حالت اسیرِ غم رہے

گُل میں بھی آتی رہی بُوئے تراب
رازِ سربستہ سے ہم محرم رہے

کونسی بسمل میں ایسی بات تھی مدتوں اس موت پر ماتم رہے

خود اپنے آپ چمکنے کی جس میں قُدرت ہو
وہ ذرّہ مُنتظرِ فیضِ آفتاب نہیں

نہ پُوچھ اہلِ جہاں سے علاجِ غمِ بسمل
یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب نہیں

کس قدر ہے حُسن کی نازک مزاجی کا خیال
حالِ دل کہتا ہوں اور کہہ کر مُکر جاتا ہوں میں
تیری رحمت نے یہاں تک کر دیا نادم مجھے
اب تو سجدے میں بھی گرتا ہوں تو شرماتا ہوں میں

غزل

قیامت ہے سرِ بالیں وہ زلفوں کا بکھر جانا
مری آشفتگی پر اُن کے چہرے کا اُتر جانا
خود اپنے سایہ سے وہ ہر قدم پر اُن کا ڈر جانا
اور اس معصومیت پر سادگی پر میرا مر جانا
بعیدِ مصلحت ہے غم میں یُوں گھُل گھُل کے مر جانا
کہ دیکھا ہے حوادث میں سے کشتی کا گذر جانا
پڑے گی پھر کوئی اُفتاد پھر آنسو رواں ہونگے
نئے طوفان کی آمد ہے دریا کا اُتر جانا

لبِ ساحل کو بوسہ دے کے یوں ڈوبی مری کشتی
کسی کا جس طرح "ہاں" کہہ کے پھر جانا مُکر جانا

نظامِ زندگی کچھ ایسے اجزا سے مُرتّب ہے
کہ ناممکن سا ہے شیرازۂ غم کا بکھر جانا

لبِ بام آفتاب آیا تو غفلت سے نقاب اُٹھی
بڑی مدّت میں ہم نے مقصدِ نورِ سحر جانا

نظر والے حقیقت سے کبھی منکر نہیں ہوتے
ہم ایسوں نے ہمیشہ زندگی کو دردِ سر جانا

جوانی بدگماں ہوتی ہے لیکن اس قدر سمجھ
کہ آئینے میں اپنے رُوبرُو ہوتے ہی ڈر جانا

غزل

شرم سے وہ آبدیدہ ہو گئے
اے جنوں! اب اور کیا درکار ہے

مسکرا کر اُٹھ گئے پہلو سے وُہ
کیسی دلکش صورتِ انکار ہے

اپنے باطن تک پہنچنا ہے محال
آدمی خود پیکرِ اسرار ہے

کیوں بگڑ بیٹھے سوالِ وصل پر
یہ ادا شرمندۂ اقرار ہے

ہر جفا ہر ظلم اُس کے واسطے
آپ کو بسمل سے کتنا پیار ہے

"آہِ نیم شبی"

کیا جاتا ہے پھر جینے پہ کیوں مجبور بسمل کو

مقدر ہے جو مر جانا یونہی گھُٹ گھُٹ کے مر جانا
یونہی حالِ خرد آشوب میں جی سے گذر جانا

حوادث کا کھلونا ہے اگر یہ شعبۂ ہستی
اگر ویران ہونے کے لئے آباد ہے بستی

رہے گی گر جبیں بیگانۂ خاکِ وطن یوں ہی
جو تڑپائے گی یادِ نغمہ سنجانِ چمن یوں ہی

جوانی گریہ و آہ و فغاں سے گر عبارت ہے
اگر یہ زندگی مجموعۂ آزار و عسرت ہے

خداوندا! اگر چشمِ عنایت ہو نہیں سکتی
اگر غیرت زدہ پر تیری رحمت ہو نہیں سکتی

اگر مقصود ہی کشتی سے رکھنا دور ساحل کو
کیا جاتا ہے پھر جینے پہ کیوں مجبور بسمل کو

غزل

یہاں انسان کچھ ملتے تو ہیں۔ کامل نہیں ملتے
اگر اہلِ نظر ملتے ہیں اہلِ دل نہیں ملتے

نگاہوں سے نگاہیں مل تو جاتی ہیں کسی پہلو
مگر۔ یہ کیا قیامت ہے کہ دل سے دل نہیں ملتے

تڑپ کر حُسن خود بابِ محبت پر جبیں رکھ دے
مگر عہدِ محبت میں اب اہلِ دل نہیں ملتے

مرا ایمان ہے اے دوست! آدابِ محبت پر
نہ جانے۔ کِس لئے اب وہ سرِ محفل نہیں ملتے

بنائے زندگی تفریق پر رکھی ہے کیا بسمل
کہ حق پر مِٹنے والوں کے بھی باہم دل نہیں ملتے

غزل

تڑپ کر شدتِ غم سے جب اُن کا نام لیتے ہیں
یہ وحشی نبضِ رفتارِ دو عالم تھام لیتے ہیں

ہم اہلِ دل کہاں احسانِ لطفِ عام لیتے ہیں
لبِ گلفام سے کیفِ مئے گلفام لیتے ہیں

یہ گورستاں نہیں۔ آرامگاہِ اہلِ دنیا ہے
یہاں ہارے تھکے آکر ذرا آرام لیتے ہیں

ہم آئینِ محبت سے تو بیگانہ نہیں لیکن
جب اُن کا ذکر آتا ہے کلیجہ تھام لیتے ہیں

حدیثِ عشق کی تفسیر سوزِ عشق ہے بسمل
خدا کے نام سے پہلے ہم اُن کا نام لیتے ہیں

تنہائی تمھیں یاد کرتی ہے"

ادب سے جھک کے عقیدت بھری نگاہوں سے
فلک نے تُم کو سرِ شاخسار دیکھا ہے
مہِ تمام نے عکسِ رُخِ تجلّی میں
قدم قدم پہ تمھیں جلوہ بار دیکھا ہے
خُود اپنے سایہ سے ڈر کر۔ بدن چُرائے ہوئے
تمھیں ستاروں نے دیوانہ وار دیکھا ہے
شفق نے تُم کو اکیلے میں کسمسائے ہوئے
ہزار بار نہیں۔ لاکھ بار دیکھا جائے

خود اپنے حُسن کی تنویر میں نہائے ہوئے
سحر نے تم کو سراپا بہار دیکھا ہے
تمھیں چمن میں ٹہلتے ہوئے اداؤں سے
گلوں نے دیکھا ہے اور بار بار دیکھا ہے
نسیمِ صبح کی اٹھکھیلیوں نے روز و شب
شرارتوں سے تمھیں ہمکنار دیکھا ہے
مگر۔ قریب سے اُس روز تم کو بسمل نے
بس۔ ایک بار۔ فقط ایک بار دیکھا ہے

سمجھ لو پھر مجھے تم التفات کے قابل	بنا دو میری خوشی کو حیات کے قابل

تمھارے رس بھرے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو
شبِ دراز کی تنہائی یاد کرتی ہے
حیا کے سایہ میں گفتار کی حلاوت کو
جوان اُمنگوں کی رعنائی یاد کرتی ہے

نگاہِ ناز سے آئی تھی جس میں رنگینی

تمہیں وہ انجمن آرائی یاد کرتی ہے

نظر کی گود میں پھر ایک بار آجاؤ

دلِ گرفتہ کی انگڑائی یاد کرتی ہے

تمہیں سنورتے ہوئے آئینے میں ہنستے ہوئے

مرے خیال کی گہرائی یاد کرتی ہے

میں جانتا ہوں جوانی کی لغزشیں کیا ہیں　　شبِ وصال کی دلکش گذارشیں کیا ہیں

ہائے۔ یہ طرزِ تغافل۔ یہ ادائے مرغوب
پھر ذرا کہئے۔ کہ۔ ہاں۔ کہہ تو دیا۔ یاد نہیں
میں خطاوار۔ اگر عہد شکن پھر سے کہوں
آپ اُسی ناز سے کہہ دیں۔ کہ ہمیں یاد نہیں
ذکرِ بسمل پہ وہ فرمانے لگے جھنجھلا کر
کوئی اس نام کا دیوانہ ہمیں یاد نہیں

جذبۂ دُعائیہ

(عزت مآب ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریۂ ہند کی صحتیابی پر)

کُھلا بابِ اثر میری دُعاؤں کیلئے آخر
کہ میرا جذبۂ دل زندگی میں آج کام آیا
عروسِ انبساطِ بیکراں مستی میں جھوم اُٹھی
نظر تھی جس پیام جانفزا پر وہ پیام آیا
شبِ تیرہ نے دم توڑا۔ سحر نے جلوہ پاشی کی
نہ ہے قسمت کہ بے پایاں مسرت کا پیام آیا

پیئے دیدارِ اقدس ذرّے ذرّے کی کھلی آنکھیں
زبانِ انجمن پر "فخرِ بھارت" کا جو نام آیا
گلوں میں تازگی آئی تو غنچے جھوم جھوم اُٹھے
دُعا بن کر لبِ تسبیل پہ وجدانی کلام آیا
میں توبہ توڑتا ہوں لُطفِ یزداں کی قسم کھا کر
حضورِ صدرِ عالی صحتِ کامل کا جام آیا
دُعا ہے مالکِ کونین سے شب زندہ داروں کی
ہمارے صدرِ اعظم عمر پائیں چاند تاروں کی

غزل

اُف! دمِ نزع بھر آئی ہیں یہ کس کی آنکھیں
مُجھ کو جینے کی ضرورت سی ہوئی جاتی ہے!

ہائے! یہ اُٹھتی جوانی کی کشاکش کہ اُنھیں
اپنے سایہ سے بھی وحشت سی ہوئی جاتی ہے

حُسن آمادۂ تکمیلِ ستم ہے اے دوست!
پھر مُجھے اپنی ضرورت سی ہوئی جاتی ہے

آگے پیتا تھا دو عالم کو بُھلانے کے لئے
اور یہ اب تو عبادت سی ہوئی جاتی ہے

جب سے وہ میرے فقط میرے ہوئے ہیں بسمل
ذرّے ذرّے سے محبّت سی ہوئی جاتی ہے

وہ ابر آیا وہ زلفِ شام بکھریں دوشِ عالم پر
یہی وہ وقت ہے زاہد! جو مشکل سے گذرتا ہے

غزل

ہم ہیں قفس ہے۔ اور خیال آشیاں کے ہیں
سارے یہ گُل کھلائے ہوئے باغباں کے ہیں

ہر ذرّہ کوئے یار کا گردِش پسند ہے
ہے تو زمیں۔ رنگ مگر آسماں کے ہیں

گم گشتگانِ راہِ حقیقت کا حال کیا
خود رہنما وہ خضرِ رہِ لامکاں کے ہیں

منزل کی کچھ خبر بھی ہے۔ کوسوں نکل گئی
غُربت نصیب! تیرے ارادے کہاں کے ہیں

بسمل سے کہہ دو۔ آج عیاں کردیں رازِ دل
کیوں زیرِ بارِ منتِ ضبطِ فغاں کے ہیں

"شانِ مجاہد"

الفاظ کی گرمی سے جو بنتے ہیں مجاہد
میدان میں وہ گردنیں رکھتے ہیں خمیدہ
گُلزار کی حُرمت کو کیا ہے نظر انداز
اور آشیاں بندی ہے سرِ شاخِ بُریدہ
کنگال ہے وہ قوم اِخوّت نہیں جس میں
پیسہ کبھی رکھ سکتی نہیں جیبِ دریدہ

غزل

کسی صورت جنوں کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
بہار آتی ہے۔ لیکن خانہ ویرانی نہیں جاتی

وہ آتے ہیں۔ مگر۔ میرا تڑپنا کم نہیں ہوتا
وہ ملتے ہیں۔ مگر۔ میری پریشانی نہیں جاتی

وہ یوں آتے ہیں جیسے گھر کی صورت تک نہیں دیکھی
وہ یوں ملتے ہیں گویا شکل پہچانی نہیں جاتی

شباب آیا تو آئی غیرت بھی اُن کے حصّے میں
کہ پہچانی ہوئی صُورت بھی پہچانی نہیں جاتی

محبت کا کرشمہ یُوں بھی دیکھا ہے کبھی بسمل
کہ دریا خشک ہو جاتا ہے طُغیانی نہیں جاتی

غزل

دل کی تسکین ؟ ۔ نہیں قسمتِ انساں میں نہیں
میں انہیں اپنا بنا لوں مرے امکاں میں نہیں

سجدے کرتا ہوں میں خلوت میں تڑپ کر ۔ رو کر
عامیانہ سی عبادت مرے ایماں میں نہیں

کیوں کھٹکتی ہے زمانے کو کسی کی لغزش
داغ لالے میں نہیں یا مہِ تاباں میں نہیں

میں وہ بربادِ ازل ہوں کہ نشیمن کیسا
میری تقدیر کے تنکے بھی گلستاں میں نہیں

بے رخی مصلحتِ حسن ہے ۔ ورنہ ۔ بسمل
ان میں جو بات ہے وہ بات ہر انساں میں نہیں

غزل

اے مذاقِ جستجوئے یار! تو لے چل کہیں
یہ زمیں ہو یا نہ ہو یہ آسماں ہو یا نہ ہو

طاقتِ پرواز ہوتی جا رہی ہے گرم کار
اب چمن ہو یا نہ ہو اب آشیاں ہو یا نہ ہو

اشک افشانی سے دل ہلکا تو ہو جاتا ہے دوست!
کیا خبر۔ یوں چارۂ دردِ نہاں ہو یا نہ ہو

سر جھکائے میری بالیں سے اٹھا ہے چارہ گر
اب وہ میری بیکسی پر مہرباں ہو یا نہ ہو

زمزمہ پرداز شاعر چاہیئے اب بزم میں
اہلِ فن ہو یا نہ ہو۔ اہلِ زباں ہو یا نہ ہو

ایک حسین یاد

اب اُن سے وہ مُلاقاتیں کہاں ہیں
مری قسمت کی وہ راتیں کہاں ہیں
پیا کرتے تھے جب چُھپ چُھپ کے باہم
وہ پیاری چاندنی راتیں کہاں ہیں
وہ میری بے خودی وہ اُن کی مستی
وہ بادہ ریز برساتیں کہاں ہیں
ملا کرتے تھے جب وہ خلوتوں میں
اب ایسی مدبھری راتیں کہاں ہیں
جوانی جن سے وابستہ تھی بسمل
وہ راتیں ہائے۔ وہ راتیں کہاں ہیں

میکدہ

رات بھیگی رات اور موسم جوانی کا سرور
ہچکیاں لیتا ہوا توبہ کا بے معنی غرور
ہر قدم پر خود فراموشی کا دلکش اہتمام
ابر کا ہر شوخ ٹکڑا بادہ نوشی کا پیام
وہ ہوائیں جن میں مستی کا تلاطم بے پناہ
وہ فضائیں جن میں فطرت کا تبسم بے پناہ
ہائے۔ وہ پُرکیف منظر۔ وہ نشاطِ بیکراں
اُف۔ وہ عنبر بار گیسوئے شبِ گوہر فشاں

اِک شرابی زہد کی دُنیا کو ٹھکراتا ہوا
آرہا تھا مسکراتا۔ ناچتا گاتا ہوا

میکدے کے پاس پہنچا طالبِ جامِ شراب
اور دروازے پہ دستک دی تو یہ آیا جواب

تجھ کو اِس دُنیا کے کچھ آداب بھی معلُوم ہیں
اس جگہ گُل مخمصے کل وسوسے معدُوم ہیں
ارتباطِ باہمی لیتا ہے انگڑائی یہاں
بے خبر! دم توڑ دیتی ہے خود آرائی یہاں
رنجِ محرومی نہ بیمِ سطوتِ املاک ہے
یہ مقام احساسِ ناداری سے بالکل پاک ہے
وسعتِ ظرفِ نظر معلُوم ہوتی ہے یہیں
تلخیٔ تاثیرِ غم معدُوم ہوتی ہے یہیں
دولت و عُسرت کا پایہ ایک ہی بالکل یہاں
احترامِ گُل نہ ذکرِ نالۂ بُلبُل یہاں

ہے یہاں کا ذرّہ ذرّہ سایۂ مذہب پاک
یہ خمستاں ہے۔ یہاں اُلفت نہیں ہوتی ہلاک
اِس جگہ ہوتا ہے رازِ سینۂ قدرت عیاں
تاجِ سُلطانی اُتر جاتا ہے نظروں سے یہاں
غیرتِ عرشِ بریں ہے سرزمینِ میکدہ
حاملِ خنجر نہیں ہے آستینِ میکدہ
حق پسندی۔ حق بیانی۔ حق نمائی ہے یہیں
ہم سری۔ ہم پائگی و ہمنوائی ہے یہیں

وہ تو اظہارِ عقیدت تھا کوئی لغزش نہ تھی
جُھک گئے تھے چُوم لینے کو درِ میخانہ ہم

غزل

نظر کے ساتھ ذوقِ دُور بینی بھی تو دے یا رب
فقط اِن کور چشموں کو نظر دینے سے کیا ہوگا

چراغِ صُبح کب تک ٹمٹمائے گا سرِ محفل
دمِ آخر مُجھے میری خبر دینے سے کیا ہوگا

مقامِ عشق میں سوزِ جگر کی بھی ضرورت ہے
بشر کو صرف معراجِ نظر دینے سے کیا ہوگا

نگاہِ عشق میں نُورِ سحر کی عُمر ہی کیا ہے
شبِ تاریک کو نُورِ سحر دینے سے کیا ہوگا

جو محرومِ جنُونِ عشق ہے بیگانۂ غم ہے
اُسے سرمایۂ حُسنِ نظر دینے سے کیا ہوگا

تو اُن کا وعدۂ فردا نہ لے کر آئیو قاصد!
کہ تشنہ لب کو خالی جامِ زر دینے سے کیا ہوگا

مناسب تھا کوئی پیغام آتا اُن کی جانب سے
مریضِ غم کو پیغامِ سحر دینے سے کیا ہوگا

یہ ایسی بات ہے جس کو نظر والے سمجھتے ہیں
بشر کو دولتِ سوزِ جگر دینے سے کیا ہوگا

زیادہ سے زیادہ شرم سے وہ سر جھکا لیں گے
اُنہیں بسملؔ کے مرنے کی خبر دینے سے کیا ہوگا

پیشگوئی

غمِ پنہاں کے کُل اسباب عُریاں ہونے والے ہیں
زمانے کے یہ شیرازے پریشاں ہونے والے ہیں

صدائے غیب سُن لیں مُطربانِ انجمن آرا
یہ نغمے کشتۂ تلخیٔ دوراں ہونے والے ہیں

فلاکت خوردگانِ عصر کے آنسو۔ معاذ اللہ
یہ ایواں منظرِ شہرِ خموشاں ہونے والے ہیں

جو قلبِ زار کی تالیف میں کام آئیں گے اکثر
کچھ ایسے رازِ باطن بھی نُمایاں ہونے والے ہیں

ہمیں معلوم ہے۔ ہم جانتے ہیں رازِ سربستہ
ہراساں کرنے والے خود ہراساں ہونے والے ہیں

چھپاتا ہے جنھیں مزدور پیشِ سطوتِ ظالم
زمانے پر وہ داغِ دل نمایاں ہونے والے ہیں
اسی سرمایہ داری کے مظالم خون روئیں گے
یہی داغِ دلِ محزوں گلستاں ہونے والے ہیں
نہ کھیل اے صاحبِ تقدیر ! مظلومانِ عسرت سے
یہی ذراتِ خورشیدِ درخشاں ہونے والے ہیں
میں جو کہتا ہوں مے نوشی کے بعد الہام ہے بسمل
مرے اشعار سے کانٹے گلستاں ہونے والے ہیں

عصرِ حاضر کی عید

مُبارک عید اے وحدت کے پروانو مُبارک ہو
یہ انعامِ الٰہی اے مُسلمانو مُبارک ہو
مُبارک ہو یہ دن اُمّت کے دیوانو مُبارک ہو
یہ دن فرمودۂ سرکارؐ کی تعمیل کا دن ہے
محبّت۔ دوستی۔ اخلاص کی تکمیل کا دن ہے
خلوصِ فطرتِ اسلام پیوستہ ہے اس دن سے
مساواتِ نگاہِ قوم وابستہ ہے اس دن سے
محبّت کی جنُوں فرمائی شائستہ ہے اس دن سے
اخوّت کے حسیں چہرے سے اُٹھی تھی نقاب اس دن
دل افزائی پہ دلجوئی پہ آیا تھا شباب اس دن

وہ جانا عیدگاہوں میں نفاست سے طہارت سے
وہ گر گر پڑنا سجدوں میں ارادت سے عقیدت سے
وہ ہونا ہم بغل دل سے رواداری سے الفت سے

وہ یُوں خیرات دینا مفلسوں کو خستہ حالوں کو
خبر تک روزِ روشن میں نہ پہنچے لینے والوں کو

چلے ہو آج بھی تم بہرِ طاعت عیدگاہوں میں
نمازی بن کے مومن بن کے دُنیا کی نگاہوں میں
مگر دیکھے بھی ہیں تم نے کچھ ایسے لوگ راہوں میں

جو طاعت کیش دل رکھتے ہیں لیکن دل میں قوت بھی
امینِ جلوۂ حق بھی ہیں اور مجروحِ عُسرت بھی

تمہارا یہ لباسِ فاخرہ زیبِ بدن کرنا
خودی میں ڈوب کر ذکرِ خدائے ذوالمنن کرنا
نہایت شان سے پرہیزِ اربابِ محن کرنا

گلے مِل کر گلے پر تیغ رکھنا تم کو آتا ہے
لہو کو آبِ احمر کہہ کے چکھنا تم کو آتا ہے

یہی ہے اب نماز و بندگی و فقر و دینداری
بہ جلوت زہد و معصومی بہ خلوت عیش و مکاری

تبسّم میں سمِ قاتل۔ تکلّم میں ریا کاری
وہی ہو تم جو ہوتے تھے تصدّق نامِ احمدؐ پر
نشاطِ دو جہاں قربان کرتے تھے محمدؐ پر

اے بندۂ خوابیدہ! میدانِ عمل میں آ
ہر گوشہ کو تاباں کر۔ ہر ذرّے کو چمکا دے
تُو نے کبھی وہ ناوک وہ تیر بھی چھوڑا ہے
افلاک پرستوں کے سینوں کو جو برما دے
دولت کے مزاروں میں طوفان اُٹھاتا چل
تُو حاصلِ دُنیا ہے دُنیا کو یہ سمجھا دے

"تفسیرِ فراق"

اُف - یہ برفانی ہَوا تیرے بغیر
کیا پیئوں او بے وفا تیرے بغیر
پاؤں میں ڈالی ہوئی زنجیر ہے
زندگی کا سلسلہ تیرے بغیر
ہے غلاموں کے دلوں کی بیکسی
یہ ہَوا اور یہ فضا تیرے بغیر
اک گُلِ صحرائی وہ بھی زرد رُو
زندگی کا مُدّعا تیرے بغیر
زندگی اور پھر ہماری زندگی؟
ہے گناہوں کی سزا تیرے بغیر

زندگی اور زندگی کی دُھوپ چھاؤں
تابکے اور تا کجا تیرے بغیر
دیدۂ بے نُور ہے میرے لئے
آرزوؤں کی بقا تیرے بغیر
زاہدوں کے دل کی ہے بے مائگی
محفلِ ارض و سما تیرے بغیر
کیوں سنبھالا سے لیا بیمار نے
ہائے۔ یہ کیا ہو گیا تیرے بغیر
مُجھ کو حیرت ہے کہ زندہ ہے ابھی
بسملؔ دردِ آشنا تیرے بغیر

تعبیرِ خواب

پھر کوئی اُٹھا ہے اہلِ دل پئے تعمیرِ قوم
کائناتِ خیر و شر کے راز سمجھاتا ہُوا

معذرت آمیز ارادوں کی جبیں کو چوم کر
دشمنوں کی خواہشِ مسمُوم ٹھکراتا ہُوا

بےحسوں کو سروری کا درس دینے کیلئے
نشۂ خوابِ ظفرمندی سے چکراتا ہُوا

فاتحانہ قوّتوں کو ہر کشاکش سونپ کر
بندگانِ بغض کے سینوں کو برماتا ہُوا

ظالمانہ سطوتوں پر مُسکرا کر شان سے
بیکسی کا عقدۂ دشوار سُلجھاتا ہُوا

بحرِ ذخارِ خودی پر اک نظر ڈالے ہوئے
اُلفت و اخلاص کا اعلان فرماتا ہوا
پاسداریٔ روایاتِ محبت کے لئے
اقتدارِ ناروا کو دل سے ٹھکراتا ہوا
اختلافاتِ سیاست کو گرا کر آنکھ سے
اپنی بیباکانہ جراٰت کی قسم کھاتا ہوا!
پھر اُسی احساسِ خودداری میں ہو کر مستغرق
پھر اُسی انداز سے تیور پہ بَل لاتا ہوا
قوم پر نقد و نظر کرتا ہوا ہر شکل میں
حق و باطل کے ہمیں اسرار سمجھاتا ہوا
پھر کوئی آیا ہے اہلِ دل سنئے انداز سے
پھر حقیقت آئے گی باہر نقابِ راز سے

یہ نظم بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر کی جسارت پر اس وقت ہوئی تھی جب آپ نے اعلان کیا تھا کہ کشمیر ہندوستان کا دائمی حصہ ہے۔

غزل

ہر بھیس میں پوشیدہ تخریب کی ہستی ہے
یہ بھی کوئی دُنیا ہے؟ یہ بھی کوئی بستی ہے

آما جگہِ غم ہے راحت کو ترستی ہے
انسان کی ہستی بھی کس کام کی ہستی ہے

پیمانہ جب اُٹھتا ہے چاندی سی برستی ہے
میخوار کا جینا ہے میخوار کی ہستی ہے

کہنے کو دلِ عاشق محدُود سی بستی ہے
سمجھو تو یہی فتنہ کونین کی ہستی ہے

میخانے میں اے زاہد! رفعت ہے نہ پستی ہے
اک یہ بھی تو دُنیا ہے اک یہ بھی تو بستی ہے

میخانے کی رونق بھی کیا رونق ہستی ہے
ہر لب پہ تبسّم ہے ہر آنکھ میں مستی ہے
جنّت کے فسانوں پر بدمست نہ ہو واعظ
جنّت جسے کہتے ہیں میخوار کی مستی ہے
بسمل کی طبیعت کا عالم نہ کوئی پوچھے
بسمل کی طبیعت تو مرنے کو ترستی ہے

غزل

تُم نے اپنا حال یہ کیا کر لیا میرے لئے
کیوں جگر پر ہاتھ ہے نامِ خُدا میرے لئے

اُف۔ مری وحشت نے تم کو کس قدر رُسوا کیا
ہائے۔ تُم نے خلق سے کیا کچھ سُنا میرے لئے

آنسوؤں کا ہار کیوں پہنا عروسِ چشم نے
کیوں گوارا کی یہ تکلیفِ دعا میرے لئے

اس سفینے کو کنارہ بھی نہ دے شائد پناہ
کیوں ہے مصروفِ تردّد ناخُدا میرے لئے

مُسکرا کر تم نے جب گردن میں باہیں ڈال دیں
گُل بداماں ہو گئے ارض و سما میرے لئے

نغمہ پیرایانِ گُلشن بھُول بیٹھے کیا مجُھے
بابِ گُلشن کھُلتے کھُلتے رہ گیا میرے لئے

موت کی یہ آخری ہچکی نہ ہو اے چارہ ساز!
ہیں دُعا گو آشنا نا آشنا میرے لئے

جب سے تُم شرما کے آغوشِ نظر میں آئے ہو
مطلعِ انوار ہیں صبح و مسا میرے لئے

حضرتِ بسمل! کبھی دیکھی ہے تم نے وہ نظر
ہائے جس نے حشر برپا کر دیا میرے لئے

"نگہِ عمیق"

جس قدر شیرازۂ غم منتشر ہوتا گیا
میرے سانسوں کا تسلسل مختصر ہوتا گیا

بیخودی میں جس طرف میرے قدم اُٹھتے گئے
ذرّہ ذرّہ مَظہرِ حُسنِ نظر ہوتا گیا

جس قدر بڑھتا رہا محبوب کی قربت کا ذوق
ہر قدم پہ بے نیازِ راہبر ہوتا گیا

جیسے جیسے روئے باطن سے نقاب اُٹھتی گئی
زندگی کی ہر ادا سے بے خبر ہوتا گیا

کِس کے شعروں سے جوانی میں کسک پیدا ہوئی
اے وفا نا آشنا! کیا تُو نے پہچانا مجھے

اے جانِ سکوں اے جانِ ادا

اِس عقل کی ماری دُنیا میں ہم دیوانوں کا کام نہیں
جو آگ میں جل کر ہنستے ہیں اُن پروانوں کا کام نہیں

اس دُنیا کی ہر محفل میں تذلیلِ جسارت ہوتی ہے
توقیرِ مذلت ہوتی ہے تحقیرِ شرافت ہوتی ہے

اشکوں کی یہاں کیا قیمت ہے کیا قیمت ہے نالوں کی یہاں
صدمہ ہے نظر والوں کو یہاں آفت ہے جگر والوں کی یہاں

یہ دُنیا ہے مومن کے لئے مومن کی فسوں کاری کیلئے
اِس دُنیا کی تخلیق نہیں الفت کی جنوں کاری کیلئے

عُسرت پہ پرستارِ دولت کرتے ہیں یہاں احساں کیا کیا
دولت کی سیہ کاری کے لئے ہوتے ہیں یہاں ساماں کیا کیا

کس کس پہلو سے تعمیلِ احکامِ امارت ہوتی ہے
تکمیلِ مقاصد کی خاطر تشکیلِ مُروّت ہوتی ہے

مصنوعی محبّت کا ہم نے اقرار یہاں بکتے دیکھا
تسبیح یہاں بکتے دیکھی زنّار یہاں بکتے دیکھا

چل اور کہیں۔ اے ہوشرُبا! ——
اے جانِ سکوں، اے جانِ ادا ——

"محبوب جواہر"

بہ حیثیتِ انسان

یہ نظم میرے ذاتی مشاہدات و تجربات کی
عکاس ہے۔ مدح و ستائش کی غماز نہیں

عاشقِ حسنِ وطن۔ طالبِ ناموسِ وطن
ایسا مونس جسے معبودِ مروّت کہیئے
ایسا دل گرم نہیں جس کی زمانے میں نظیر
ایسا دلجو جسے مسجودِ محبّت کہیئے

بندۂ شانِ خودی۔ مالکِ اسلوبِ جمیل
ایسا مُخلص جسے مقصودِ ریاضت کہئے
فرقہ داری کا جو دشمن ہے وہ انسان ہے یہ
نظمِ قومی کے لئے صرف پریشان ہے یہ
ہے مُناسب جو اسے کہتے ہیں "پیغمبرِ امن"
رہنُمایانِ وطن میں ہے یہی جانِ عوام
صدمہ ہوتا ہے اِسے پھُولوں کے مرجھانے سے
اس کی نظروں میں ہے اندازِ پریشانِ عوام
کلیاں چٹکی ہیں تو ایک اس کی اشارت پا کر
اب وہ اگلا سا نہیں ہند میں بُحرانِ عوام
یہ وہی ہے جو چلا ہے کبھی انگاروں پر
ہے تفوّق اِسے گاندھی کے پرستاروں پر

تول کر نظروں میں اس صاحبِ دل کا کردار
حق بجانب ہوں جو محبوبِ وطن کہتا ہوں
آج الزام تراشی کا نہیں خوف مجھے
اس گلِ خنداں کو ارمانِ چمن کہتا ہوں
زاویے اس کے پئے سازِ چمن ہیں ایسے
کہ اسے منحرفِ رسمِ کہن کہتا ہوں
یہ وہ کافر ہے جو ایمان سے بیگانہ نہیں
اس کی سیرت ہدفِ لغزشِ رندانہ نہیں

طنز

ایک دن میں امیر بن جاتے
بیٹھے بیٹھے دبیر بن جاتے
دَورے کرتے۔ سلامیاں لیتے
کاش! ہم بھی وزیر بن جاتے

"اُن سے آخری شکایت"

"تائیدِ محبت سے حاصل۔ تکلیفِ عنایت سے حاصل
اب موت کی سوئی سرحد پر اندوہِ مجسّم آ پہنچا
جذبات میں اب ہیجان نہیں انفاس میں اب ترتیب نہیں
بیمارِ غمِ بے پایاں کا اب آخری عالم آ پہنچا

اب سینہ زیر و زبر کیوں ہے اب نالہ کناں کیوں ہوتے ہو
ان گول گلابی گالوں پر کیوں زلفیں پریشاں ہوتی ہیں
ہونٹوں سے تبسّم رخصت ہے آنکھوں سے شرارت غائب ہے
آزار کی جتنی شکلیں ہیں تیور سے نمایاں ہوتی ہیں

وہ عالم تم کو یاد نہیں ارماں جب ہچکی لیتا تھا
جب نبضِ تمنا رکتی تھی اُمید جب آہیں بھرتی تھی
پندارِ جمالِ خود بیں سے جب خونِ محبت ہوتا تھا
جب چشمِ وفا میں آنسو تھے۔ جب آرزو ماتم کرتی تھی

وہ عالم پھر تم یاد کرو جب دل میں کسک پیدا کی تھی
ارمان بھرے سنسار میں جب پیغامِ اجل لائے تھے تم
جب پیار کے سُندر سپنوں میں تم آگ لگا کر ہنستے تھے
قزاقِ سکوں بن کر اک دن جب میرے یہاں آئے تھے تم

دم توڑ رہی تھی جب اپنا جمعیتِ خاطر چھپ چھپ کر
جب خون کے آنسو پیتا تھا بسمل سا شاعر چھپ چھپ کر
وہ عالم پھر تم یاد کرو

جذباتِ دُعائیہ

(یہ نظم لالہ کرپا نرائن رئیس دہلی کی دُختر ذی اقبال اُرملا کی شادی پر کہی گئی تھی)

شادیانوں اور مُبارک بادیوں کے درمیاں
اُرمِلا! اس گھر سے رُخصت ہو رہی ہے آج تُو
کچھ دُعائیں ہیں بزرگوں کی جو تیرے ساتھ ہیں
اپنی شائستہ مزاجی سے کرے گی راج تُو

ہر نشاطِ زندگی ہر گام پر زندہ رہے
زندگی بھر موتیوں سے مانگ تابندہ رہے

اے حیا کی مُورتی! اے نیکدل! پاکیزہ خُو!
ہو تجھے سسرال کا ہر ذرّہ صد رشکِ اِرَم
منزلِ انوار ہو تیرے پتی کا گھر تجھے
رہنمائے عالَمِ نسواں ہو تیرا ہر قدم
گُلشنِ ہستی کا تجھ سے غُنچہ غُنچہ مُسکرائے
تیرے ماتھے کی یہ بندی جاودانی عُمر پائے

آسماں سے پھُول برسیں تیرے آنچل کیلئے
چاند تارے ہوں تری شانِ عروسی پر نثار
ہر تمنّائے دلِ نازک رہے نغمہ سرا
ہو بہارِ جاوداں تیری اُمیدوں کی بہار
ہر دل آویزی کا مسکن تیرا کاشانہ رہے
زندگی بھر آنسوؤں سے آنکھ بیگانہ رہے

اور اک پیغام بھی ہے تیری دُنیا کے لئے
چھُوٹنے پائے نہ تجھ سے دامنِ حُسنِ عمل
زندگی موقوف ہو شوہر پرستی کے لئے
تیرے مُنہ سے بات جو نکلے وہ نکلے برمحل
تیرے ہر انداز کی تقلید ہو سنسار میں
امتیازی حُسن ہو گفتار میں کردار میں

آج تو ماں باپ کے گھر سے دُلہن بنکے چلی
اپنے اس گھر کے مراتب کا رہے تجھ کو خیال
کیا تری تہذیب ہے اور کیا ترے آداب ہیں
تو جہاں جائے وہاں بن کر رہے اپنی مثال
خاندانی عظمتوں کو بھُولنے پائے نہ تُو
رفعتِ گردوں کو خاطر میں کبھی لائے نہ تُو

تجھ کو سیتا اور ساوتری کے افسانے ہیں یاد
تجھ کو حاصل ہو تعارف پدمنی کے نام سے
اپنے اجداد و اقارب سے ہے تجھ کو اعتقاد
تو رہے دنیا میں اے جانِ پدر آرام سے
ماں کی ممتا باپ کی شفقت رہے مدِّ نظر
عمر بھر سسرال کی عزّت رہے مدِّ نظر

غزل

وہی قیدِ نظر۔ قیدِ زباں ہے
قفس کا نام گویا آشیاں ہے
نہ چھیڑ اس دَور میں یہ مُردہ نغمے
غزل سُننے کی فرصت اب کہاں ہے
زمانہ کھیلتا ہے آنسوؤں سے
ابھی برہم مزاجِ آسماں ہے
تباہی کی شکایت رہزنوں سے؟
ترے افکار کی وحدت کہاں ہے
اگر تابندہ ہے خود اِعتمادی
زمیں تیری ہے۔ تیرا آسماں ہے

خذف پہ مرنے والے کو خبر کیا
صَدف میں دُرِّ لاثانی نہاں ہے
سرِ کہسار ٹھکراتا ہُوا چل
کہ جو پیدا ہے وہ تجھ میں نہاں ہے
گُذر گاہِ مہ و پرویں ہے محدُود
مگر تیری خُودی آشفتہ جاں ہے
تُو ہی ہے حاصلِ بزمِ دو عالم
تری منزل ورائے کہکشاں ہے
کُھلے بندوں نہ کر تنقید سنبھل
یہ اپنا دیس ہے۔ ہندوستاں ہے

"کردارِ عظیم"

برشِ شمشیر بھی کرنے نہ پائے سرنگوں
آدمی کو اس قدر خود دار ہونا چاہیئے
حشر تک ہونے نہ پائے غلبۂ تاثیرِ خواب
خواب سے کچھ اس طرح بیدار ہونا چاہیئے
زندگی کو محرمِ اسرار کرنے کے لئے
مبتلائے شدتِ آزار ہونا چاہیئے!
جھوم کر لب رکھ دئے جس نے لبِ تلوار پر
ایسے دل والے سے ہم کو پیار ہونا چاہیئے

سرنگوں ہونا کمالِ عشق ہے یا سربلند
آدمی کو محرمِ اسرار ہونا چاہیئے

خوبیٔ اخلاق کے پیشِ نظر۔ زیرِ اثر
گُل تو گُل ہے خار سے بھی پیار ہونا چاہیئے

بسملِ وارفتہ کی باتوں پہ وہ کہنے لگے
ایسا دیوانہ تو زیبِ دار ہونا چاہیئے

آنکھ میں تصویرِ حسرت تھی لبوں پر نام تھا
مرنے والے کا نہ جانے آپ سے کیا کام تھا
مدتوں بیمار تڑپا گریۂ پیہم کے ساتھ
موت کے سایہ میں سونا کتنا مشکل کام تھا

ہم اپنی ہستیٔ موہوم سے انکار کرتے ہیں
تمھاری ہستیٔ جاوید کا اقرار کرتے ہیں
جبینِ سجدہ ریز اے زاہدِ ظاہر نما کیا ہے
جو تو دن بھر نہیں کرتا وہ شب بیدار کرتے ہیں
کبھی تم بسملِ آزردہ دل پر بھی نظر کرنا
تمھارے چاہنے والے ہیں تم کو پیار کرتے ہیں

غزل

وہی اِنسان ذی کردار - ذی احساس ہوتا ہے
جسے ہر رنگ میں اپنی زباں کا پاس ہوتا ہے

تمھاری غم نوائی بھی کھٹکتی ہے مرے دل کو
میں شاعر ہوں مجھے ہر بات کا احساس ہوتا ہے

تم اپنی سرد مُہری سے سکونِ دل نہ کھو بیٹھو
بہت غم ناک انجامِ شہیدِ یاس ہوتا ہے

نہ جانے خود فراموشی کا عالم بھی ہے کیا عالم
نہ کوئی پاس آتا ہے نہ کوئی پاس ہوتا ہے

نہ ٹھکراؤ - تمنّائے دلِ بسمل نہ ٹھکراؤ
خبر ہے تم کو؟ شاعر کس قدر حسّاس ہوتا ہے

زمانہ سازیوں سے میں ہمیشہ دُور رہتا ہوں
مجھے ہر شخص کے دل میں اُتر جانا نہیں آتا

مرا ہر شعر بسملؔ ترجمانِ دردِ پنہاں ہے
وہ شاعر کیا جسے دُنیا کو تڑپانا نہیں آتا

"دلِ کے داغ"

کب مجھے بخشا ہے اُس نے مایۂ سوزِ تمام
جب محاسنِ موت کو محبوب کہہ کر رہ گئے

لاف زن ہے دَور، حاضر بزنگاہِ دُور رس
صاحبِ کردار ہر اُفتاد سہ کر رہ گئے

ہمّت افزائی اربابِ سخن ہوتی ہے کب
چند آنسو چشمِ نم خوردہ سے بہ کر رہ گئے

کم سے کم اتنی تو رعنائی ہو احساسات میں
غیر کو بھی خواہش کی فطرت عطا ہوتی رہے

رہ نہ جائے باغِ عالم میں رواجِ امتیاز
خار کو بھی گُل کی کیفیت عطا ہوتی ہے
پابجولاں ہو نہ فکرِ ہر کس و ناکس کبھی
درد کے ماروں کو بھی عزت عطا ہوتی ہے

نیکیوں کی حد کبھی قائم ہوئی ہے دہر میں ؟
یہ سمندر وہ ہے جو شرمندۂ ساحل نہیں
زندگی بھر راس آتی ہے کسے یہ زندگی
صاحبِ حُسنِ نظر اِس کی طرف مائل نہیں
یاس کے مارے ہوئے دیکھے ہیں دُنیا نے کبھی
گویا یہ لطفِ نگاہِ ناز کے قابل نہیں
کس کی خاطر نظم کرتا ہوں میں اپنے دل کے داغ
راستہ تاریک ہے اور رہبرِ منزل نہیں

"یادِ رفتہ"

کبھی غربت میں یارانِ وطن کی یاد آتی ہے
کبھی رنگِ چمن ۔ جانِ چمن کی یاد آتی ہے
تڑپ اُٹھتا ہوں جب اہلِ چمن کی یاد آتی ہے
کہ اُٹھتے بیٹھتے عہدِ کہن کی یاد آتی ہے

چمن کا بوٹا بوٹا ہے مری چشمِ تصور میں
کبھی گُل کی کبھی سرو سمن کی یاد آتی ہے
میں تنہائی میں دو آنسو بہا لیتا ہوں چُپکے سے
جب اُس نازک ادا ۔ نازک بدن کی یاد آتی ہے

وفورِ درد سے دم گھُٹ کے رہجاتا ہی سینے میں
وطن سے دُور رہ کر جب وطن کی یاد آتی ہے
اب اُس عالم میں ہوں میری خبر مجھ تک نہیں آتی
مگر۔ رہ رہ کے اس کے بانکپن کی یاد آتی ہے
مری وارفتگی کا راز بسمل کوئی کیا جانے
مجھے آٹھوں پہر اپنے وطن کی یاد آتی ہے

ذرا صبر اور تجھ کو برقِ آتش بار ہو جاتا
میں تنکے چُن رہا تھا آشیاں تیار ہو جاتا
مذاق اُڑا نا یُوں عہدِ وفا کا ایک عالم میں
جو تُجھ کو بھی کسی مردِ وفا سے پیار ہو جاتا

محبت ہی محبت کی دوا معلوم ہوتی ہے
یہیں تو ابتدا میں انتہا معلوم ہوتی ہے

جوانی ہے نہ باندھو زلفِ شبگوں رُخ پہ آنے دو
یہ اس عالم میں یوں بھی خوشنما معلوم ہوتی ہے

کچھ ایسی روح فرسا کروٹیں لی ہیں زمانے نے
نگاہِ آشنا نا آشنا معلوم ہوتی ہے

غزل

ننگِ آدابِ وفا بن جائیں کیا
غم کا افسانہ زباں پر لائیں کیا
موت نے پہنا ہے ہستی کا لباس
گردشِ دوراں سے ہم گھبرائیں کیا
درمیانِ جادۂ مرگ و حیات
ماہ و انجم کے مقامات آئیں کیا
کس لئے آہوں سے لب ہوں آشنا
ہم وفا کے سامنے جھک جائیں کیا
عرضِ مطلب پر نگاہیں جھک گئیں
اس سے آگے اور وہ فرمائیں کیا

فکرِ اُن کے در پہ ہے محوِ سجود
قید کی سختی سے ہم گھبرائیں کیا

زندگی توہینِ غیرت ہی سہی
آنسوؤں میں ڈوب کر مر جائیں کیا

زندگی ہے مسکرانے کے لئے
موت کا عالم نظر میں لائیں کیا

غرق ہے بسملؔ شراب و شعر میں
زندگی کے راز اُسے سمجھائیں کیا

کیا عشق نے دیا ہی نازک سہارا اُنکو
آنکھوں کے راستے سے دلمیں اُتارا اُنکو

زمیں پر اب بھی اُترے گی نہ جنّت حضرتِ بسملؔ
وہ آیا ساقیٔ گُلفام وہ گردش میں جام آیا

یومِ حُرّیت

(یہ نظم ۱۹۵۴ء میں کہی گئی تھی)

قفس سے نکلے ہوئے سات سال ہوتے ہیں
یہی وہ دن تھا کہ جس دن رہا ہوئے ہیں ہم
اُٹھا تھا ہند سے انگریز کا جنازہ آج
اُسی جنازے پہ نغمہ سرا ہوئے ہیں ہم
رہے ہیں عہدِ فرنگی میں مدتوں محبوس
بہت دنوں میں چمن آشنا ہوئے ہیں ہم

وہ دِن کہ غیر کی چشمِ کرم کے تھے محتاج
اب اپنی کشتی کے خود ناخُدا ہوئے ہیں ہم
یہ انقلاب مُبارک کہ آج دُنیا میں
بلند بانگ و شرف آشنا ہوئے ہیں ہم
نقوشِ عہدِ غُلامی مٹے جبینوں سے
نگاہ لڑنے لگی آسماں نشینوں سے
مگر ابھی ہے بہت دُور منزلِ مقصُود
ابھی شعُورِ اخوّت کا جام باقی ہے
ابھی وطن کی عمارت ہے تشنۂ تکمیل
ابھی حصُولِ نشاطِ دوام باقی ہے
بہارِ رفتہ کو لانا ہے شان و شوکت سے
چمن میں پھُول کھلانے کا کام باقی ہے

نہ آئے سعیِ مسلسل پہ مُردنی غالب
بس۔ اک دو یوم خزاں کا قیام باقی ہے
کچھ اور چاہیئے عزم و عمل میں سرگرمی
سحر کی آنکھ میں تصویرِ شام باقی ہے
بغیر جنبشِ افکار کائنات کہاں
جمُود و خواب میں تابانیٔ حیات کہاں

نوازش اور پھر اتنی نگاہِ برقِ سوزاں کی
مقدر ہے نشیمن کا فضیلت ہے گلستاں کی
الٰہی! اِس فریبِ رنگ و بُو میں ہم نہ آئیں گے
یہاں آئینۂ گلشن میں صُورت ہے بیاباں کی

غزل

یوں علاجِ غم کہاں کرتے ہیں بے باکانہ ہم
پہلے رُک کر چُوم لیتے ہیں درِ میخانہ ہم

وہ تو اظہارِ عقیدت تھا۔ کوئی لغزش نہ تھی
جُھک گئے تھے چُوم لینے کو درِ میخانہ ہم

یہ چمن آماجگاہِ برقِ آتشبار ہے
ہائے۔ کر بیٹھے مُرتّب کس جگہ کاشانہ ہم

رہ گئے سب دم بخود جب اُسنے جُھک کر یہ کہا
کون ہے اب اہلِ دل۔ کس کو کہیں دیوانہ ہم

اُس نے دیکھا ہے نظر بھر کر کچھ اِس انداز سے
شیشہ بازیٔ خرد سے ہو گئے بیگانہ ہم

معاذ اللہ! جُنبش پُتلیوں تک کو نہیں ہوتی
نہیں معلُوم۔ کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

غزل

یہ شرما کے کس کی نظر رہ گئی
تمام انجمن جھوم کر رہ گئی

حیا نے جوانی سے کیا کہہ دیا
یہ کیوں اُٹھتے اُٹھتے نظر رہ گئی

نظر نے تو سب کچھ عیاں کر دیا
فغاں کس لئے بے اثر رہ گئی

کب اُن کی سماعت پہ گذری ہے بار
کہ جب داستاں مختصر رہ گئی

دمِ نزع یہ جانکنی الاماں
اجل آتے آتے کدھر رہ گئی

بہانہ مِل گیا دُنیا کو شبنم کہہ اُٹھی ورنہ
پسینہ آگیا تھا گُل کو فریادِ عنادل سے

کسان

تُو اپنا اتھک سہارا دے کر گرے ہوؤں کو سنبھالتا ہے
زمیں کے سینے کو چاک کر کے زر و جواہر نکالتا ہے
زمیں کا انمول چپّہ چپّہ ادب سے لیتا ہے نام تیرا
بشر کے وہم و گماں کی حد سے بہت پرے ہے مقام تیرا
وطن کے اربابِ ناز و نعمت پکارتے ہیں کسان تجھ کو
مگر نصیبِ فلک رسا نے دئے ہیں دونوں جہان تجھ کو
ترقیوں کی تمام راہیں ترے پسینے پہ منحصر ہیں
مگر مشینوں پہ مرنے والے تری حقیقت سے بے خبر ہیں
نگاہِ شاعر میں اے جفاکش! تُو اَن داتا ہے کُل جہاں کا
مگر جہاں کی نگاہ میں تُو مجسّمہ ہے غمِ نہاں کا

لیکن

تُو اپنی ہستی سے بیخبر ہے نہیں ہے خود پر نگاہ تیری
ہمیشہ اپنوں میں ہے پرایا جُدا ہے منزل سے راہ تیری
یہ راز اب تک نہ تُو نے سمجھا حقیقتِ کائنات کیا ہے
نظامِ اہلِ چمن ہے کیسا جمالِ رُوئے حیات کیا ہے

"سرِ فضیلت"

یوں تو ہر نجمِ درخشاں میں کشش ہوتی ہے
لیکن آغوشِ سحر سب کے لئے باز نہیں

رازِ پنہاں میں اُترتی ہے کہاں عام نظر
جنم لیتے ہیں مصائب میں خیالاتِ حسیں

ذرہ ذرہ ہے کہاں حلقہ بگوشِ تنویر
کتنے اربابِ چمن ہوتے ہیں معراج نشیں

چشمۂ نور اُبلتا ہے یہاں سب کے لئے
لیکن آسودۂ تقدیر ہر انسان نہیں

وقف ہے عرشِ فضیلت پئے مردِ ایثار
زیب دیتا ہے انگوٹھی پہ تراشیدہ نگیں

یہ تم اک رات میں کیا ہو گئے بسمل کے مرنے پر
جہاں میں یوں کسی کی موت کا ماتم نہیں کرتے

غزل

(اس غزل کے ساتھ ایک بہت پرانی یاد وابستہ ہے۔ پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی کے یہاں شعر و سخن کی ایک چھوٹی سی نشست ہر ماہ ہوتی تھی اور ہر سال ان کے ایما پر ایک ہندوستان گیر مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا۔ مشاعرے کی تاریخ قریب تھی لہٰذا ساحرؔ صاحب نے مصرع طرح کے متعلق اشارہ کیا۔ اس نشست میں منشی چندی پرشاد شیداؔ دہلوی۔ منشی پیارے لال رونقؔ دہلوی مولانا ظفر تاباںؔ دہلوی۔ پنڈت دینا ناتھ معجزؔ دہلوی۔ منشی چندربھان کیفیؔ دہلوی اور نسیمؔ دہلوی جیسے قابلِ ذکر سخنور موجود تھے۔ شیداؔ صاحب نے کہا کہ کسی ایک شاعر سے مصرع لیا جائے۔ رونقؔ صاحب نے خاکسار کی طرف دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اس مرتبہ بسملؔ صاحب سے تقاضا کرنا چاہیئے"۔ ساحرؔ صاحب نے تائید کردی۔ غرض میں نے ایک دو روز کی مہلت مانگی۔ اور مصرع وقت کے تقاضے کے زیرِ اثر ساحرؔ صاحب کی خدمت میں ان کے شاگردِ رشید منشی شیام لال سحرؔ مرحوم کی معرفت بھیجدیا۔ مصرع تھا ؎

"گلستانِ جہاں یارب نئے سر سے جواں پھر ہو"

جب یہ مصرع شائع کیا گیا تو منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی نے فرمایا کہ بسملؔ دہلوی نے ہم لوگوں کا امتحان لیا ہے۔ ردیف بہت مشکل ہے۔" خیر مشاعرہ ہوا اور کامیاب ہوا۔ اس مشاعرے میں حکیم اسد علی خاں مضطرؔ دہلوی جیسے ماہرِ فن بزرگ بھی تشریف فرما تھے۔ جب میں غزل پڑھ چکا تو انھوں نے شفقت سے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فرمایا کہ "میاں دولہا! خوب غزل پڑھی ہے۔" اس کے بعد مضطرؔ صاحب کے یہاں باقاعدہ آمد ورفت شروع ہوگئی۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان کی صحبتِ فیض منزلت سے بہت کچھ حاصل کیا۔ باریک بینی اور وضعداری ان پر ختم تھی۔ اب یہ سب بزرگ دوسری دنیا میں ہیں اور میں ان کی روح فرسا یاد کا دفینہ لئے موت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ حوصلہ افزائی کرنے والے ایسے خلوص کیش اب کہاں)۔

فریبِ آب وگل صرفِ بہارِ بوستاں پھر ہو
گلستانِ جہاں یارب! نئے سر سے جواں پھر ہو
مددا ے سوزِ عشق اتنی میں دامنگیر ہو جاؤں
انھیں اپنی گلی کی خاک کا مجھ پر گماں پھر ہو
ابھی تک برقِ سوزاں کی شرر انگیز صورت ہے
چمن میں چار تنکوں سے مرتب آشیاں پھر ہو

ذرا اپنا بھی ہم ظرفِ نگاہِ شوق دیکھیں گے
اُسی انداز سے وہ طُور پر جلوہ کُناں پھر ہو

مجھے پھر انتشارِ ہر دو عالم کی ضرُورت ہے
کسی کی نیم باز آنکھوں سے کوئی نیم جاں پھر ہو

ترا طرزِ ستم آموز گارِ درسِ الفت ہے
ہمارے جذبۂ شوقِ فنا کا امتحاں پھر ہو

دلِ جاں سوز نخچیرِ نگاہِ عربدہ جُو ہے
اسے گردش کا شکوہ کس لئے اے آسماں پھر ہو

کوئی مہجور پھر لذّت کشِ دشنام ہو جائے
الٰہی صرفِ اندازِ ستم آتش زباں پھر ہو

تہِ افلاک جس نے دُودِ آہِ سوز دیکھا ہے
نہ کیوں وہ عُمر بھر منّت کشِ ضبطِ فغاں پھر ہو

یہی تو مُدّعا ہوگا تبسُّم ہائے پیہم کا
کہ دل پہلو میں مُضطر صورتِ برقِ تپاں پھر ہو

چلو وحشی سہی لیکن ایمنِ ناز ہے بسمل
کہ اُس کے شعر سے کیوں رازِ وحشت کا عیاں پھر ہو

غزل

کہوں کیسے قاتل کو قاتل یہی ہے
مروت ہے نظروں میں مشکل یہی ہے
پیام قضا پر تو نغمہ سرا ہو
اسیرِ وفا! تیری منزل یہی ہے
شبِ زندگی کو سحر دینے والے
تلاطم مبارک کہ ساحل یہی ہے
نظر بھی نہ عکاسِ حالِ زبوں ہو
کہ تلقینِ آدابِ محفل یہی ہے
ہو پھر تازہ دار و رسن کی حکایت
حیاتِ اسیرِ سلاسل یہی ہے
جنوں کو کیا جس نے ممنونِ حکمت
وہ دانائے اسرارِ بسمل یہی ہے

غزل

کیا خبر۔ اِس پردۂ تخلیق میں کیا راز ہے
زندگی کے ہر قدم پر اک نیا انداز ہے

رہ گیا ہے کیا کوئی نظمِ عناصر میں قصور
روزِ اوّل سے مزاجِ زندگی ناساز ہے

ماورائے حدِّ امکاں ہے اب اپنا آشیاں
اور یہ تو ابتدائے کاوشِ پرواز ہے

سینۂ دریا کبھی رہتا ہے موجوں سے تہی
زندگی کا درد ہی تو زندگی کا راز ہے

غیب سے پھر کچھ نہ کچھ ارشاد ہونا چاہیئے
پھر کوئی آوارہ فطرت گوش بر آواز ہے

آپ کو بسمل کا افسانہ پسند آنے لگا
کیا بیانِ دردِ پنہاں میں نیا انداز ہے

غزل

بس۔ اک وارفتۂ خاطر ہی تمھارا مُدّعا سمجھا
کہ ہر بیداد کو سامانِ تکمیلِ وفا سمجھا
طلب گارِ وفا کو لائقِ تیغِ جفا سمجھا
ہُوئے تُم یُوں بھی اپنے یُوں بھی اپنا آشنا سمجھا
نظر ملتے ہی گردن جُھک گئی فرطِ ندامت سے
تغافل کیش نے پھر بھی نہ میرا مُدّعا سمجھا
تُمھارے مُدّعا کی کون کر سکتا ہے تفسیریں
وہ خُود کھویا گیا جس نے تمھارا مُدّعا سمجھا

کبھی تیور پہ بل آئے کبھی آنکھوں میں اشک آئے
خدا جانے۔ وہ ظالم میری خاموشی کو کیا سمجھا
میں اُن کے سامنے چُپ ہوں وہ میرے سامنے چُپ ہیں
وہ میرا مدعا سمجھے میں اُن کا مدعا سمجھا
ستم گر! یہ اُسی غم خوردہ بسمل کا جنازہ ہے
کہ جس نے تیرے غم کو زندگی کا آسرا سمجھا

غزل

تمہاری سرمگیں آنکھوں میں آنسو کیوں چھلک آئے
مریضِ ہجر کو دستِ قضا کی آزمائش ہے

نگاہِ ناز میں بجلی۔ خرامِ ناز میں شوخی
ارے یہ کس گرفتارِ بلا کی آزمائش ہے

تو اتنا دل شکستہ کیوں ہے انکی کج ادائی پر
شہیدِ یاس! یہ تیری وفا کی آزمائش ہے

تڑپ کر وہ حریمِ ناز سے باہر نہ آجائیں
مجھے پھر اپنی آہِ نارسا کی آزمائش ہے

جگر پر ہاتھ رکھتے اِک زمانہ ہو گیا بسمل
تجھے یہ کس کے پیمانِ وفا کی آزمائش ہے

غزل

میں نے یہ کب کہا کہ غمِ کارگر نہ دے
لیکن۔ تو میرے صبر کو عمرِ شرر نہ دے
آئینۂ فریب نہ کر میرے رُوبرُو
اے حسنِ بے خبر! مجھے ذوقِ خبر نہ دے
افسانۂ حیات کی اُڑنے لگے ہنسی
وہ ابروؤں کو زحمتِ جنبش اگر نہ دے
زاہد کا ظرف دیکھ حضورِ قدح پرست
ذرّے کو اعتمادِ فروغِ نظر نہ دے
کیوں کھو رہا ہے شکوۂ غم سے وقارِ غم
اے تشنۂ مُراد! وہ یہ بھی اگر نہ دے
وہ پیکرِ جمیل ہے غم آشنا نہیں
بسملؔ کی موت کی کوئی اُس کو خبر نہ دے

میں درد کی قیمت جانتا ہوں الفت کی روِش پہچانتا ہوں
جب درد گلہ بن جاتا ہے الفت کو زوال آجاتا ہے

"عالمِ یاس"

طوفان کچھ ایسا آیا ہے سب اپنی جان کو رو بیٹھے
اب ماتمِ کشتی کیا کیجے دریا کا کنارا ڈوب گیا
میں جس کے اُجالے میں پہروں منزل کو نہارا کرتا تھا
آکاش کے ساگر میں بسمل اِک وہ بھی تارا ڈوب گیا

غزل

شہیدِ ناز کو کانٹوں پہ بھی آرام ہے ساقی
غلامانِ امارت سے مجھے کیا کام ہے ساقی
میں اپنی بادہ نوشی کا تدارک کر نہیں سکتا
جوانی لغزشوں کا ایک دلکش نام ہے ساقی
اُٹھا مینا۔ بڑھا ساغر۔ نہ جا میری تباہی پر
کہ ہر شے کا بالآخر موت ہی انجام ہے ساقی
ابھی دادِ ستم مجھ سے زمانہ لے نہیں سکتا
ابھی نظروں میں تو ہے اور تیرا جام ہے ساقی
جو تیرے میکدے سے اُٹھ گیا اشکِ رواں پی کر
اُسی نسل کا تاریخِ ادب میں نام ہے ساقی

"بربریت کا جنازہ"

شبِ تاریک کے سینے سے سحر پھوٹ چکی
فکرِ تازہ کا دیا پہلی کرن نے پیغام
نغمگی پیدا ہوئی باغ کی ہر پتّی سے
بن گئے غنچہ و گل جامِ مئے لالہ فام
زیبِ آغوشِ نظر ہیں نئی منزل کے نقوش
موت کے گھاٹ اُترنے کو ہے فرسودہ نظام
صرفِ تعمیرِ گلستاں ہیں نظریاتِ جدید
حُسن منسوب ہوا مہر و مساوات کے نام

یاس نے پہنا ہے اُمیّد کا جامہ اے دوست!
بامِ رفعت پہ پہنچنے کو ہے تقدیرِ عوام
بربریّت کے وہ سنگین محل خاک ہوئے
دامنِ جبر و گریبانِ ستم چاک ہوئے
آگیا بدلے ہوئے وقت کے چہرے پہ جلال
ٹوٹ جانے کو ہے سرمایہ پرستی کا خمار
حق یہ حق دار کا ہونے کو ہے پھر عام رواج
پھر مرے دیس میں جمہور کو حاصل ہے وقار
دستِ مزدور پہ توقیر نے بیعت کی ہے
عزمِ دہقاں نے فضیلت سے لیا ہے اقرار
تاجداری نے بھری بزم میں دم توڑ دیا
عدل و انصاف کے چہرے پہ اب آئیگا نکھار

درد میں ڈوبے ہوئے دل سے صدا اُٹھے گی
زندگی سے کوئی نالاں ہے نہ کوئی بیزار
اب کسی بات کی ہو گی نہ حمایت بیجا
راستہ اخذ کرے گی نہ حکومت بیجا

مزدُور

میں آج سمجھا ہُوں یہ حقیقت دیارِ غُربت بھی ہے وطن میں
حریر و دیبا کا جسم دا تا ہے ایک بوسیدہ پیرہن میں
وطن کی قسمت کا پہلے دن سے ستارۂ صنو فگن تو ہی ہے
جو پہلے دن سے شباب پر ہے وہ رونقِ انجمن تو ہی ہے

"نہ جانے کیوں"

اب جو وہ پاس سے کترا کے گزر جاتے ہیں
بیخودی میں کوئی تقصیر ہوئی ہے شاید
اب جو وہ آنکھ ملاتے ہوئے شرماتے ہیں
ذوقِ آوارہ کی تشہیر ہوئی ہے شاید
اب وہ اگلا سا انھیں ذوقِ تکلم بھی نہیں
اُن کے ترسے ہوئے ہونٹوں پہ تبسم بھی نہیں

یا تو وہ بارِ جوانی سے پریشان سے ہیں
یا انہیں چھیڑتی رہتی ہے محبت کی نظر
یا تمناؤں نے طوفان اٹھا رکھا ہے
یا کھٹکتی ہے کلیجے میں شرارت کی نظر
ورنہ یوں بنتی ہوئی بات بگڑتی ہے کبھی
جو نظر مل گئی اک بار وہ لڑتی ہے کبھی

غزل

بارگاہِ بےخودی میں کیوں وہ پردہ پوش تھا
تابِ نظّارہ تھی کس کو کس کو اپنا ہوش تھا

ہائے۔ وہ کافرتمنّاؤں کا بختِ کامیاب
ہائے۔ وہ عالم کہ جب وہ زینتِ آغوش تھا

مسکراکر ہائے۔ یہ کہنا کسی کا ناز سے
کیا خبر۔ کیوں ایک عالم بےنیازِ ہوش تھا

کس لئے بیمارِ غم نے ہنستے ہنستے جان دی
آپ کو بھی کچھ خبر تھی۔ آپ کو بھی ہوش تھا

پَرتَوِ حُسنِ نظرافروز کو کیا کیجئے
اپنی جانب سے تو وہ ہرچند پردہ پوش تھا

نزع کا عالم بھی کتنا دِل شکن عالم ہے دوست!
وہ اُدھر خاموش تھے بسمل اِدھر خاموش تھا

غزل

مری سب دُعائیں قبول ہیں مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے
مرے پاس ہے مئے جانفزا - مرا سر ہے زانوئے یار پر

مری کامیابیٔ عشق پر یہ فضائیں کیوں نہیں جھومتیں
ابھی روشنی سی ہوئی تھی کچھ ابھی آئے تھے وہ مزار پر

میں چمن کا محرمِ راز ہوں میں جہاں کا نبض شناس ہوں
نہ خزاں سے مجھ کو کبیدگی - نہ نگاہ میری بہار پر

یہی بندگی ہے مرے لئے - یہی سجدہ ہے مرے واسطے
نظر اٹھی اٹھ کے ٹھہر گئی تری خاکِ راہگذار پر

یہ گلوں پہ کس نے ستم کیا - یہ ہوا ہے غنچوں پہ کیا غضب
کوئی گلفروش نہ ہو یہاں - ہے شکن جبینِ بہار پر

وہی اپنا مسلکِ بادہ کش جو ملا بھی ہے تو کہاں ملا
کبھی میکدے کی فضاؤں میں - کبھی آستانۂ یار پر

فیضانِ مُحبّت

تخیّل کی دُنیا میں آباد ہُوں میں
چمن ہو کہ زنداں ہو آزاد ہوں میں
بہت شادماں ہوں بہت شاد ہوں میں
تمھاری جفاؤں سے برباد ہوں میں
یہ امدادِ صہبا پرستیٔ پیہم
فنا کارِ احساسِ اُفتاد ہوں میں
مذاقِ غمِ جاوداں دینے والے
ابھی تو یہ احساسِ بیداد ہوں میں

"تخیلات"

ہستی کی کروٹ پیکِ اجل اور پیکِ اجل پیغامِ سکوں
ہستی جب کروٹ لیتی ہے آلام سے فرصت ہوتی ہے
طوفان سے کشتی بچ نکلی تو ساحل سے مجروح ہوئی
ملاح پہ اب یہ بھید کھلا قسمت پھر قسمت ہوتی ہے
اللہ رے سولہ سال کا سِن رفتار نئی گفتار نئی
اس عمر کی کیا تعریف کروں یہ عمر قیامت ہوتی ہے

کشتۂ تیغِ ستم ہونا نہیں آتا مجھے
ہائے۔ در پردہ ابھی رونا نہیں آتا مجھے
کیا خبر دُنیا کو بسمِل کس لئے بیتا ہوں میں
زندگی کو رائیگاں کھونا نہیں آتا مجھے

غزل

شعارِ ظلم بیجا پر ندامت تم کو حق ناحق
نظر میں ہے حیا ناحق جبیں پر ہے عرق ناحق

مرے اظہارِ غم نے تم کو پہنچایا قلق ناحق
تمہارے سامنے چھیڑا یہ مضمونِ ادق ناحق

میں اپنی راہ سے بھٹکا ہُوا محفل میں آنکلا
رُخِ روشن ہُوا جاتا ہے ہم رنگِ شفق ناحق

کبھی ہم نے تمہاری شان میں گستاخیاں کی ہیں
جبینِ مہروش پر آئے جاتا ہے عرق ناحق

تڑپنا اُس کی خُو ہے آہ کرنا اس کی فطرت ہے
تمہیں بسمِل کی بیتابی سے ہوتا ہے قلق ناحق

جو عُقدہ کوششِ پیہم سے آساں کرتا جاتا ہوں
وہ عُقدہ اور مُشکل اور مُشکل ہوتا جاتا ہے

"صاف بیانی"

درحقیقت نام کے اِنسان بستے ہیں یہاں
آدمی کے بھیس میں شیطان بستے ہیں یہاں
کون کہتا ہے کہ تاریکی میں ہے تابندگی
کیا کسی کی موت میں رقصاں ہے اپنی زندگی
بے خبر محرم نہیں توحید کے قانوں سے
سُرخیٔ مذہب لکھی جاتی ہے اپنے خُون سے
سنگ ریزے کو کوئی دُرِّ عدن سمجھا تو کیا
خار کو اپنی جہالت سے چمن سمجھا تو کیا
قتل کے غارت گری کے لاکھ رستے ہیں یہاں
جانور مہنگے ہیں اور انسان سستے ہیں یہاں

غزل

کوئی معبدے میں پرایا نہیں ہے
نمودِ مساواتِ کامل یہیں ہے
تمہارا مزاج اور اپنا مقدّر
بس اِن ظالموں کو تغیّر نہیں ہے
نگاہوں سے بھی کی نہ فریاد تُو نے
ارے مرنے والے! تجھے، آفریں ہے
مچل اُٹھے سجدے تڑپ اُٹھے جلوے
ترے آستاں پر یہ کس کی جبیں ہے
جُدا کیوں نہ رنگِ سخن ہو ہر اک سے
کہ بسمِلؔ کسی کا مُقلّد نہیں ہے

"رات کی رات"

ہائے ۔ یہ مست فضا ۔ ہائے ۔ یہ برسات کی رات
کیا بگڑ جائے جو رہ جاؤ یہیں رات کی رات

ہاتھ میں جام ہے ۔ پہلو میں سمن پیکر ہے
یوں جوانی میں بسر ہوتی ہے برسات کی رات

ابرِ باراں کی یہ شوخی یہ صبا کی مستی
مان بھی جاؤ ۔ ٹھہر جاؤ یہیں رات کی رات

کب ترس آتا ہے ناکامِ تمنا پہ تمہیں
تم مقرر کہاں کرتے ہو ملاقات کی رات

تم نے بسملؔ کے لئے یہ بھی کبھی سوچا ہے
کس طرح کٹتی ہے اُس مستِ خرابات کی رات

ہیچ تھا جن کی نگاہوں میں یہ رنگِ کائنات
تیرے میخانے سے اب وہ بادہ آشام اُٹھ گئے

جن میں ڈھلتی تھی شرابِ قلب آشامِ حیات
وہ سفالی ساغر و پیمانہ و جام اُٹھ گئے

میکدہ تھا جن کے دم سے رشکِ فردوسِ بریں
اب وہ رندانِ شرابِ ساغر آشام اُٹھ گئے

رہ گئے ہیں رہبرانِ حیلہ ساز و خود پرست
جاں نثارانِ وطن، مرہونِ آلام اُٹھ گئے

اُمیدِ یاس انگیز

ہم اُن کا یہ کرم بھی آزما کر دیکھ لیتے ہیں
فریبِ وعدۂ فردا میں آ کر دیکھ لیتے ہیں

اب اُمیدِ وفا میں جان تو باقی نہیں، لیکن
پھر اُن کی انجمن میں آج جا کر دیکھ لیتے ہیں

جب اُن کے رُوبرُو حرفِ تمنّا لب پہ آتا ہے
وہ شرمیلی نظر سے مُسکرا کر دیکھ لیتے ہیں

وہ ہم پر مہرباں تو ہوں ہمارا حال تو پُوچھیں
ہم ارمانوں کی میّت بھی اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں

کرم فرمائی کی اُمید تو کم ہے مگر، بسملؔ
ہم اُن کے آستانہ پر سر جھکا کر دیکھ لیتے ہیں

آگیا پیکِ اجل اچھا ہُوا
یہ سفر بھی تشنۂ انجام تھا
درد کے کام آگیا میرا وجُود
ورنہ مجھ سے کیا کسی کو کام تھا

غزل

نگاہِ یاس کو منظور ہوں میں
بہت شاداں بہت مسرور ہوں میں
ترا ملنا ہے خود کو بھول جانا
اب اپنے آپ سے مستور ہوں میں
محبت کی یہ وہ منزل ہے اے دوست!
جہاں اپنی نظر سے دور ہوں میں
حیا سے جھک نہ جائیں تیری نظریں
شکایت کیا کروں مجبور ہوں میں
اب اتنا ہوش بھی باقی نہیں ہے
ترے نزدیک ہوں یا دور ہوں میں

غَزَل

شرم سے وہ پانی پانی ہو گئے
اے جنوں! اب اور کیا درکار ہے
وہ بھی ہیں اپنی جوانی کے شکار
حُسن خُود لذّت کشِ آزار ہے
مُسکرا کر اُٹھ گئے پہلو سے وہ
کتنی دِل کش صُورتِ انکار ہے
اپنے باطن تک پہنچنا ہے محال
آدمی خود پیکرِ اسرار ہے
ہر ادا تجھ میں سِمٹ کر آگئی
اب ترے بسمل کو کس سے پیار ہے

"عرفانِ کامل"

میخانے میں وحدت ہی کردار پرستی ہے
اک یہ بھی تو دُنیا ہے اک یہ بھی تو بستی ہے

کہنے کو دلِ عاشق محدُود سی بستی ہے
سمجھو تو یہی فتنہ کونین کی ہستی ہے

آما جگہِ غم ہے۔ راحت کو ترستی ہے
انسان کی ہستی بھی کس کام کی ہستی ہے

میخانے کی رونق بھی کیا رونق ہستی ہے
ہر لب پہ تبسُّم ہے۔ ہر آنکھ میں مستی ہے

پیمانہ جب اُٹھتا ہے۔ رحمت سی برستی ہے
میخوار کا جینا ہے میخوار کی ہستی ہے

جنت کے فسانوں پر قربان نہ ہو زاہد   جنت جسے کہتے ہیں میخوار کی مستی ہے

"نوائے سروش"

نہ ہوگی کُند جب شمشیرِ برّاں سخت جانی سے
ضعیفی جب سُنے گی غم کے افسانے جوانی سے
تعلّق قطع جب ہونیکو ہو گا زندگانی سے
تو کیا لے جائے گا اے بیخبر! دُنیائے فانی سے

نظر میں پھرتے ہونگے کُل نتائج بھی عواقب بھی
سمجھ میں آ گئے ہونگے رعُونت کے مطالب بھی
گرفتارِ قلق ہونگے ملازم بھی مصاحب بھی
سرِ بالیں کھڑے ہونگے احبّا بھی اقارب بھی

کسی کے نوجواں ارمان مٹّی میں ملے ہوں گے
کسی کے کلبۂ احزاں میں لاکھوں گُل کھلے ہوں گے
کسی کے ضبطِ پیہم سے لبِ نازک سِلے ہوں گے
کسی کو زندگی بھر اپنی قسمت پر گلے ہوں گے

کسی کی عنبریں زُلفیں پریشاں ہو گئی ہونگی
کسی کی چوڑیاں ماتم پہ قرباں ہو گئی ہونگی
کسی کی آنکھ روتے روتے ویراں ہو گئی ہونگی
کسی کی حسرتیں رُخ پر نمایاں ہو گئی ہونگی

بتا۔ اے کورِ باطن! تیرا اندازِ نظر کیا ہی؟
جو اُس وقت آئے تیرے کام وہ رَختِ سفر کیا ہی؟
تری نخوت بھی حشمت میں امارت بھی اثر کیا ہی؟
تجھے معلوم ہے۔ تیری حیاتِ مختصر کیا ہی؟

کبھی اندیشۂ فردا سے مُنہ ڈالا گریباں میں
کبھی دل سے سُنا افسانۂ فطرت گُلستاں میں
نظر آیا کبھی داغِ سیہ ماہِ درخشاں میں
کسی گُل کو کبھی ہنستے ہوئے دیکھا بیاباں میں

کبھی دریا کو مٹّی پر جبیں گھستے ہوئے دیکھا؟
کبھی زخمِ دلِ صد چاک کو رستے ہوئے دیکھا؟

"صدائے باطن"

خرقہ و دستار سے مکر و ریا کی ہے نمود
شیخ! اِن سے بادۂ گلرنگ کے ساغر خرید

زندگی کا ماحصل ہے بے نیازی بے خودی
کیوں نہیں ہوتا تو اپنی معرفت سے مستفید

آدمیّت کو خدا کے واسطے دھوکا نہ دے
جانتا ہوں کیوں بناتا ہے زمانے کو مرید

جو درد تھا دل میں ہے وہی آج جگر میں
اے جانِ ادا ! بات ابھی گھر کی ہی گھر میں
مہتاب زمیں پہ ہے کہ میں ہوں سرِ مہتاب
اک نور کا عالم متواتر ہے نظر میں

آئینہ دوراں

آسودۂ نشاط کو عسرت کی کیا خبر
اے زر پرست! تجھ کو حقیقت کی کیا خبر

رہتی ہے عید تیرے اشاروں کے سایہ میں
ہوتا ہے تو شریکِ محرّم کبھی کبھی
سامانِ انبساط میسّر ہے صبح و شام
بچھتی ہے تیرے گھر صفِ ماتم کبھی کبھی
ہر گاہ تیرا دل ہے اُمنگوں سے ہمکنار
ہوتا ہے تو ملال سے محرم کبھی کبھی
ہو کرب کی ذرا سی کسک جس میں مُستتر
آتا ہے پیش تجھ کو وہ عالم کبھی کبھی

اور کشتگانِ دشنۂ افلاس کو بھی دیکھ
ہوتے ہیں خشک دیدۂ پُرنم کبھی کبھی
ملتی ہے اِن کو فرصتِ آرام بعدِ مرگ
لیتے ہیں یہ عتاب زدہ دم کبھی کبھی
رونے کے بعد ہوتا ہے کچھ صبر کچھ سکوں
از لسبلہ وہ بھی مہمل و مبہم کبھی کبھی
ملتا ہے اِن کی محنتوں کا یُوں صِلہ انھیں
چشمِ فریب جیسے ہو پُرنم کبھی کبھی

آلودۂ گناہ کو طاعت کی کیا خبر
اے زر پرست! تجھ کو حقیقت کی کیا خبر

"چین کا حملہ یا دعوتِ بیداری"

یہ حقیقت ہے کہ گہوارۂ تہذیب ہے ہند
اس کی تعمیر پہ فردوس بھی شرماتا ہے
یہ چمن وہ ہے جہاں خار بھی بیگانے نہیں
اس کی وحدت پہ حریفوں کو بھی رشک آتا ہے

اس کے کردار سے جھکتی ہی فرشتوں کی جبیں
حسنِ جذباتِ وفا پر یہیں آیا ہی شباب
یہ اخوت میں دیانت میں ہے آپ اپنی نظیر
چہرۂ عدل و اماں سے یہیں اُٹھی ہی نقاب

یہ ہے اندازِ نظر یہ ہے ہمارا کلچر
اہلِ بیداد کو پلکوں پہ بٹھایا ہم نے
مُفسِدوں کو نہ دیا پائے حقارت سے جواب
شعلہ سامانوں کو سینے سے لگایا ہم نے

روشنی مثلِ قمر ہم سے نہیں لی کس نے
کس پہ احسان نہیں ہند کی فیّاضی کا
کوئی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھے
کون آئینہ ہے دانائی کا نبّاضی کا

اور جب آیا ہے شجاعت کا شہادت کا مقام
ہم نے دُشمن کی ہر اُفتاد کو للکارا ہے
بر تریت کے تسلسل سے ہوئے ہیں سرتاب
جوشِ ایثار میں جلّاد کو للکارا ہے

تیغِ بُرّاں سے بغل گیر ہوئے ہیں ہم لوگ
برقِ سوزاں سے مِلائی ہیں نگاہیں ہم نے
گردشِ چرخ کو ہر گام پہ ٹھُکرایا ہے
گردنِ موت میں ڈالی ہیں یہ باہیں ہم نے

ایسے جی دار ہیں ہم لوگ کہ شاہد ہے فلک
عرصۂ رزم میں ہونٹوں سے تبسّم نہ گیا
آگ کے دریا میں دیکھا ہے اُتر کر سَو بار
شوقِ ایذا نہ مِٹا - ذوقِ ترنّم نہ گیا

قسمتِ چین کے مالک یہ بتائیں ہم کو
کون باطل ہے - صداقت کا پرستار ہے کون
دوستی کِسی کے فسادات سے مجروح ہوئی
کون ایمان کا حامی ہے - ریا کار ہے کون

چین نے ارضِ وطن پر جو کیا ہے حملہ
ایسے حملوں سے جبیں پر کہیں بل پڑتے ہیں
خوب ہوتا ہے جب آفاتِ سماوی کا نزول
اہلِ دِل فرطِ مسرت سے اُچھل پڑتے ہیں

یہ تو اک دعوتِ بیداریٔ لافانی ہے
وقت نے خوابِ مسلسل سے جگایا ہے ہمیں
کیوں نہ اِس حملہ کو بازیچۂ اطفال کہیں
دیس کے پیار نے چھاتی سے لگایا ہے ہمیں

نوٹ :۔ چین نے ہندوستان کی ارضِ پاک پر ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء کو جب حملہ کیا تھا
یہ نظم اُس وقت ہوئی تھی۔

شاعر

ترجمانِ جذبۂ اقدس تیری فکرِ رسا
تو رُخِ رازِ حقیقت سے اُٹھاتا ہی نقاب
محرمِ سترِ دروں ہے کس قدر تیری نگاہ
گُل کے پیراہن میں آتی ہے تجھے بوئے تراب
بخشتا ہے تو زمانے کو شعورِ زندگی
اور زمانے کو ہے تیری زندگی سے اجتناب

"پروردگار سے"

تمام صاحبِ ادراک ۔صاحبِ احساس
ترے حضور بس اِتنی اپیل کرتے ہیں
یہ رَہبرانِ وطن یہ فریب کار وزیر
وطن کے ساتھ مذاقِ ذلیل کرتے ہیں

یہ بھولے بھالے غریب اور سادہ لوگوں کو
سلام لے کے ترقّی کے وعدے کرتے ہیں
یہی ہیں بختِ شہیدانِ یاس کے بانی
پہن کے کھادی کے کُرتے تجوری بھرتے ہیں

"آخری مُلاقات"

(زندگی کا ایک جزو آشوب و جگر فرسا سانحہ)

شب بھر مری بالیں پہ وہ تنویر کا رہنا
اُف ۔ دیدۂ مخمُور سے وہ اشکوں کا بہنا
مُنہ پھیر کے وہ اُس کا لجاجت سے یہ کہنا
ہنگامِ سحر ہونے کو آیا ہے ۔ اُٹھو بھی
رو رو کے ستاروں کو جگایا ہے ۔ اُٹھو بھی

اس صدمے سے کیا جی مرا ہلکان نہیں ہے
بے چین نہیں ہے کہ پریشان نہیں ہے
کیا اِس دلِ محزوں میں یہ ارمان نہیں ہے
آیندہ یہ آنکھیں نہ یُوں پُرنم ہوں الٰہی
گیسُوئے شبِ وصل نہ برہم ہوں الٰہی

لیکن یہ مُقدّر ہے۔ مُقدر نہیں بس میں
اللہ نے مِلایا تھا ہمیں چار برس میں
اور کھائی تھیں اِک دوسرے نے جان کی قسمیں
ٹھہرا نہ مگر دِل ۔ نہ بھرے زخم جگر کے
محتاج رہے نالۂ شب گیر اثر کے
دیکھو۔مری مانو۔ اُٹھو۔اب ہوش میں آؤ
ناکامیٔ پیہم سے نہ تم جوش میں آؤ
آؤ۔ دمِ آخر مری آغوش میں آؤ
ہم روتے رہیں چرخ کو منظُور یہی ہے
اِس درپئے آزار کا دستُور یہی ہے
برباد کیئے دیتے ہو تم اپنی جوانی
اچھی نہیں ہر وقت کی آشفتہ بیانی
اب ختم کروگے بھی یہ قصّے یہ کہانی

دُنیا میں سِسکنا ہی نہیں کام تمُھارا
تم وہ ہو کہ ہر دل میں بسے نام تمُھارا

یہ آٹھ پہر شکوۂ بے مہریٔ قِسمت
دِن رات کا یہ سوگ یہ صدمہ یہ صعوبت
یہ پیار ہے یا جان پہ نازل ہے مصیبت

مرقد میں اُترنے کو ترستی تو نہیں ہیں
آزردہ نہ ہو تم۔ ابھی مرتی تو نہیں ہیں

مانا کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے مگر یوں
تم کو گلۂ شومیٔ قِسمت ہے مگر یوں
احساسِ جگر سوزیٔ فرقت ہے مگر یوں

عرضِ غمِ پنہاں کا طریقہ نہیں آتا
رونے کا بھی تم کو تو سلیقہ نہیں آتا

اظہارِ محبت کو محبت نہیں کہتے
آجائے جو لب پر اُسے چاہت نہیں کہتے
کہتے ہیں تو اربابِ فراست نہیں کہتے

میں یہ نہیں کہتی کہ تمھیں لاگ نہیں ہے
جو شعلہ نہ دے سینہ میں وہ آگ نہیں ہے

فطرت کا تقاضا ہے محبت مگر ایسی
زیبا ہے تدبر سے بغاوت مگر ایسی
محبوب سے ہوتی ہے شکایت مگر ایسی

نادان نہ بنو۔ وضعِ محبت کو نہ چھوڑو
تم میرے لئے دامنِ غیرت کو نہ چھوڑو

اور یُوں تو بڑی چیز ہے تاثیرِ محبت
تاثیرِ محبت سے ہے نخوت کی ہلاکت
نخوت کی ہلاکت میں ہر انسان کی عظمت

اچھا ہے کہ وابستۂ اُفتاد رہو تُم
دُنیائے مُحبّت کو سدا یاد رہو تُم
اشکوں میں تواتُر بھی تسلسُل بھی یُوں ہی ہو
برباد قناعت بھی تحمّل بھی یُوں ہی ہو
ایوانِ مسرّت کا دِیا گُل بھی یُوں ہی ہو
ہونٹوں پہ اِسی شان سے آتی رہیں آہیں
لڑتی رہیں تاروں کی نگاہوں سے نگاہیں
لیکن کِسی مُفلس کِسی نادار کی خاطِر
بے چارہ و بے یار و مددگار کی خاطِر
محتاج کی خاطِر کسی بیمار کی خاطِر
اور خوبیٔ تقدیرِ وطن بھی ہو نظر میں
ہے رات کی ظلمت بھی نہاں نُورِ سحَر میں

ہاں! میرے لئے دل کبھی ناشاد نہ کرنا
مرجاؤں اگر میں تو مجھے یاد نہ کرنا
سر پھوڑ کے دل توڑ کے فریاد نہ کرنا
سمجھا کوئی اِنساں جو مشیّت کے اِشارے
طُوفان سے لڑ کر وہ لگا اپنے کنارے
یہ کہہ کے مرے سینے پہ وہ سر کا گِرانا
بجلی کو بغل میں لئے وہ ابر کا آنا
دُھندلی سی فضا میں وہ کسی سایہ کا گانا
وہ آئے تھے ہنسنے کو مگر رو کے چلے ہیں
شاید کہ ہمیشہ کو خفا ہو کے چلے ہیں

وہ اُن کا کسمسا کر زینتِ آغوش ہو جانا
مسرّت سے وہ میرا بے نیازِ ہوش ہو جانا
مرے مرنے پہ فرماتے ہیں وہ نیچی نگاہوں سے
یہ تم سے کب کہا تھا ہم نے یُوں خاموش ہو جانا

یہ محفلِ انجم ہے مرے اشکوں سے بیدار
بیدار ہے شاعر تو ہے بیدار زمانہ

"نزولِ الہام"

ہے قریب المرگ اب سرمایہ دارانہ نظام
کیا ہوا مزدور گر ڈوبا ہوا ہے قہر میں
کھل گیا رازِ امارت ہر دلِ مظلوم پر
اب نہ ہوگا کوئی بے کس خوار و رسوا دہر میں
بے کسوں کے دیدۂ نمناک لَو دینے لگے
تیر گویا رفتہ رفتہ بجھ رہے ہیں زہر میں
وہ مبارک دن بھی آئے گا کہ جب دیکھیں گے لوگ
خودسروں کے سر لئے پھرتے ہیں کُتّے شہر میں

اِس مجموعہ کی کتابت پروین رقم سید احمد علی صاحب

خوش نویس دہلوی نے کی ہے

"سُکھ منی صاحب" کے ترجمے کی کتابت بھی آپ ہی نے کی تھی۔

سید صاحب نہایت وضعدار اور پاکیزہ اخلاق

ہستیوں میں سے ہیں

بسمل دہلوی